کچھ بلوچی افسانے (اردو تراجم)

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم

www.facebook.com/groups/AAKUT/

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	مترجم	صفحہ نمبر
	مضامین			
1	بلوچی افسانہ--ایک اجمالی جائزہ			3
2	بلوچی ادب کے پچاس سال-ایک جائزہ	زینت ثناء		6
	افسانے			
1	رومال	منیر مومن	واحد بخش بزدار	12
2	دہشت	منیر احمد نادینی	شرف شاد	15
3	ڈھول بتاشوں کا انجام	منیر احمد نادینی	شرف شاد	24
4	چشمہ اور گلاب	غنی پرواز	غنی پرواز	28
5	سُوکھے پتوں کا سنگیت	پروفیسر صباد شتیاری	مہجور بدر	31
6	سب مر گئے۔۔۔۔	یعقوب شاہ غرشین	یعقوب شاہ غرشین	34

بلوچی افسانہ۔۔۔ایک اجمالی جائزہ

افسانے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بلوچی ادب میں ابھی تک اس نے نصف صدی کا سفر طے کیا ہے۔ پھر بھی نثری اصناف میں سے یہ واحد صنف ہے جس میں پیش رفت ہوئی ہے، معیار کے لحاظ سے اور مقدار کے لحاظ سے بھی۔ بلوچی افسانے کے آغاز سے متعلق بزرگ دانشور عبداللہ جان جمالدینی لکھتے ہیں (۱)

> ''بلوچی افسانے کا آغاز تراجم کی صورت میں ہوا یعنی بلوچی زبان کے شاعروں اور مترجمین نے سب سے پہلے اردو اور انگریزی زبان کے افسانوں کو بلوچی میں ترجمہ کیا۔ رفتہ رفتہ بلوچی زبان میں طبع زاد افسانے لکھنا شروع ہوئے۔''

بلوچی زبان میں افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۱ء سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ جمالدینی صاحب نے لکھا ہے اردو اور انگریزی افسانے سے متاثر ہو کر بلوچوں نے اپنی زبان میں اس صنفِ ادب کا آغاز کیا تو یہاں یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت کے کتنے لوگوں کو انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ ظاہر ہے بہت کم افراد ایسے تھے جو انگریزی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے بلوچی افسانے کا آغاز اصل میں اردو سے متاثر ہو کر ہوا۔ اس زمانے میں اردو افسانہ ترقی پسندوں کے تابع تھا اور موضوع کے اعتبار سے ترقی پسند افسانہ اپنے سماج کی معاشی، ثقافتی اور معاشرتی طرزِ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا تھا۔ تکنیکی لحاظ سے بیانیہ اسلوب میں حقیقت کو بیان کرنا افسانہ نگار کے لیے ضروری تھا۔

بلوچی زبان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں یہ خوبیاں ایک حد تک پائی جاتی ہیں۔ ایک حد تک اس لیے کہ بہت کم افسانہ نگار اس صنف میں کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ (اور وہ صرف معیار کی حد تک، مقدار کی حد تک نہیں) ان میں شیر محمد مری، ظہور شاہ ہاشمی، کریم دشتی، مراد ساحر، نسیم دشتی اور محمد بیگ بیگل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے بہت اچھے افسانے تحریر کیے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بلوچی ادب کے ابتدائی دور کے جتنے بھی افسانہ نگار تھے یا ہیں وہ کمیٹڈ افسانہ نگار نہ بن سکے۔ مثلاً سید ہاشمی نے شاعری اور تحقیق میں خود کو مصروف کر لیا۔ کریم دشتی نے شاعری اور تنقید کو اپنایا۔ مراد ساحر نے افسانے کے میدان کو ترک کر کے شاعری میں نام کمایا۔ بیگ نے طنز و مزاح کو اپنا ذریعۂ اظہار بنا لیا۔ اس کے بعد بلوچی افسانے کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ (۲)

یہ دور ڈاکٹر نعمت گچکی سے شروع ہوتا ہے۔ غنی پرواز، منیر بادینی، حکیم بلوچ، صبا دشتیاری، غوث بہار، غنی طارق، علی رئیسی، گوہر ملک، عباس علی زیمی اور حفیظ حسن آبادی کے علاوہ اور بہت سے افسانہ نگاروں کا تعلق اسی دور سے ہے۔ جس دور کو ہم بلوچی افسانے کا دوسرا دور کہتے ہیں، اس زمانے میں اردو ادب میں ایک نئی تحریک شروع ہوئی جسے جدیدیت کہتے ہیں۔ لیکن بلوچی افسانہ شعوری طور پر اس سے متاثر نہیں ہوا۔ البتہ غیر شعوری طور پر اس تحریک کے اثرات بلوچی افسانے پر پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ روایت سے انحراف ہی کو جدیدیت کہتے ہیں۔ منحرف ہونے والوں میں سے نعمت اللہ گچکی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ انہوں نے حقیقت نگاری کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید اسلوب میں متنوع موضوعات پر افسانہ نگاری کے ایسے رجحان کی ابتدا کی جو آنے والے افسانہ نگاروں کے لیے آئیڈیل ثابت ہوئے۔

منیر بادینی ایک الگ اسلوب کے مالک افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقت کے ساتھ ساتھ تخیل اور داخلیت بھی ہے۔ ان کا افسانہ ''چم بندنوک'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ (۳)

''میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں تم بھی پری کے طرف دار ہو۔''

مجھے دوسری بار ہنسی آئی۔ میں نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے آصف کی طرف داری میں کہا۔ ''یعنی اس ظاہری دنیا کے علاوہ ایک اور باطنی دنیا بھی ہے۔''

''ہاں بالکل!'' آصف نے فوراً مجھ سے اتفاق کیا۔

منیر کے افسانے ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ صبا کے افسانوں میں فلسفیانہ افسانے بکثرت ملتے ہیں (۴) ''انسان کو اپنی زندگی کا سچ خود تلاش کرنا چاہیے کیونکہ دوسروں کے دیئے ہوئے یقین سے اپنا تلاش کیا ہوا شبہ بہتر ہے۔''

غنی پرواز کو بلوچی افسانہ نگاری کی تاریخ میں سب سے زیادہ افسانوی مجموعوں کے مصنف ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اگر انہیں بلوچی زبان کا پریم چند کہا جائے تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔ پرواز کے ناقدین کہتے ہیں کہ کردار اس کے قیدی ہیں۔ وہ جو چاہیں اپنے کرداروں سے کروا لیتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میرے خیال سے اس کے جواب میں سعادت حسن منٹو کے درج ذیل جملے ہی کافی ہیں۔ (۵)

''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''

پہلے دور میں افسانے کا ذکر ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ہوا دوسرے دور میں غیر شعوری طور پر جدیدیت اور جدید افسانہ زیرِ بحث آئے اور تیسرے دور میں جدیدیت شعوری طور پر بلوچی افسانے پر اثر انداز

ہوئی۔ اسی تحریک کی وجہ سے افسانے میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ افسانہ حقیقت کے بجائے علامت اور تجرید کی پٹڑی پر چلنے لگا۔ افسانے میں معروضیت کے بجائے موضوعیت کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ سماج کے مقابلے میں فرد کو زیادہ اہم سمجھا گیا۔ جدیدیت کے زیرِ اثر لکھنے والے افسانہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن معیار کے حوالے سے دیکھا جائے تو بہت عمدہ افسانے پڑھنے کو ملیں گے۔ اے آر داد، حنیف شریف اور گوہر بالی نے اپنے افسانوں میں علامت کے ساتھ ساتھ تجرید کا بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

''اس وقت مارکیٹ کے پچھواڑے میں ایک دکان کھلی تھی، کوئی بیٹھا ہوا تھا۔(۶)''

''شیش ناگ ان کی آنکھوں کو ڈس جاتا ہے۔ سپاہیوں کے لشکر سے کوئی تھک کے وہاں بیٹھ جاتا ہے۔'' حنیف شریف کا ''یلہ چر کسہ ئے کاریت''۔ ''گلام جرکنگ لوٹیت'' اور "Menses"" بھی جدید کہانی کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں۔ آصف شفیق گو کہ کم لکھتے ہیں مگر جب بھی لکھتے ہیں تو جدید اسلوب میں لکھتے ہیں۔ ابھی تک میں نے آصف کے دو اچھے افسانے پڑھے ہیں ''فیلڈ ورک'' اور ''کلیت''۔ ''فیلڈ ورک'' سرئیلی اسلوب میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ اور ''کلیت'' میں قدیم اور جدید اندازِ بیاں کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

یونس حسین اور محسن بالاچ کا اسلوب Discoursive ہے یعنی بیانیہ میں علامت کا استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر یونس کے افسانوں میں یہ عنصر خاصا نمایاں ہے ''زریں چمانی آلاڈ''۔ ''گاریں عکس''۔ ''حسکیں چمگ'' اور ''ڈریکولا'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے اور بہت سارے ہم عصر ہیں جو شاید جدیدیت سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ انھوں نے بھی خالص بیانیہ اسلوب میں بہت موثر افسانے تحریر کیے ہیں۔ ان میں خاص طور پر فضل خالق، رزاق نادر، بیزن صبا، مقبول انور، زاہد رفیق اور یاسین مجروح کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر بلوچی ادب کی یہ صنف ارتقاء کی جانب گامزن تو ہے مگر اس صنف پر تنقیدی نظر دوڑانے والوں کی کمی اب بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔

حوالہ جات

۱) ماہنامہ ''بلوچی'' افسانہ نمبر اکتوبر ۱۹۹۹ء۔

۲) زمانی لحاظ سے نہیں تہاریک اور نظریے کی بنیاد پر اسے بلوچی افسانے کا دوسرا دور کہا جاسکتا ہے۔۔ رحمدل رمضان۔

۳) ماہنامہ ''آساپ''، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء۔

۴) ماہنامہ ''بسترانک'' مارچ ۲۰۰۲ء۔

۵) سعادت حسن منٹو کا افسانوی مجموعہ ''پھندنے''۔

۶) افسانہ ''اشکن''، سہ ماہی ''چمگ'' جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء، مصنف اے آر داد۔

زینت ثناء

بلوچی ادب کے پچاس سال۔ایک جائزہ

اس سے پیشتر کہ بلوچی ادب کے موجودہ خدوخال اجاگر کیے جائیں' مناسب ہوگا کہ بلوچ قوم کی تاریخی قدامت کا حوالہ دیا جائے۔ محققین نے ابھی تک جتنی تحقیق کی ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلوچ قوم نسلاً آرین ہے۔ پانچ سو سال قبل مسیح اس کا مرز بھوم بحیرہ کیسپین کے جنوب مشرقی ساحل کے آس پاس تھا۔ان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر مالداری پر تھا۔ جب اس خطے میں ذریعہ گزران میں دقت ہوئی' وہ مشرقی وسطیٰ کی جانب نقلِ مکانی کر کے پہلے شام کے علاقے حلب میں نوشیروان سے بھی بہت پہلے کوہ البرز میں پھیل گئی جس کی گواہی شاہنامہ فردوسی نے بھی دی ہے۔اس نقل مکانی کی ایک جھلک اس نظم میں بھی نظر آتی ہے۔جسٹس میر خدا بخش بجرانی مری اپنی کتاب ''قدیم بلوچی شاعری'' میں لکھتے ہیں:۔

ما مریدوں یا علیؓ دین وایمان سیوتیں
حمزہءَ اولاد بلوچ انت سہب درگاہءَ گورءانت
اچ حلبءَ پادکاؤں گوں یزیدءَ جھڈوانت
کلبلا بھنپورِ نیامءَ شہر سیستان منزل!انت ا۔

ترجمہ:

''ہم حضرت علیؓ کے پیروکار ہیں' دین اور ایمان میں کامل ہیں' حمزہ کی اولاد بلوچ کو ہر آن فتح و نصرت ملی ہے۔ہم حلب سے نقلِ مکانی کر کے آئے کہ حضرت حسینؓ کی حمایت میں یزید سے مخالفت تھی۔ کربلا اور بھنپور کے درمیانی علاقے میں آباد ہوئے''۔

جسٹس میر خدا بخش بجارانی اس نظم کی تشریح اپنی ایک اور کتاب ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' میں اس طرح سے بیان کرتا ہے۔کہ اس دور کے بعض خانہ بدوش عرب قبیلوں کی طرح بلوچوں کی ایک بڑی شاخ بھی شام حلب کے گردونواح میں مقیم تھی۔چونکہ وہ سامی النسل تھے' اس لیے ان میں کچھ کرمان میں رہائش پذیر ہو گئے۔اور ۶۴۳ھ میں عربوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ بلاذری کہتا ہے کہ عربوں سے جنگ اور شکست کے بعد کرمان کے یہ بلوچ یا القفص یا ان کے کچھ ساتھی سیستان اور مکران آ گئے تھے۔غالباً یہ ان کی پہلی ہجرت تھی۔ حالات کربلا کے بعد شام سے مشرق کی جانب بلوچوں کی دوسری ہجرت ہوگی۔اس نظم کے حوالے کی ضرورت

اس لیے محسوس ہوئی کہ بلوچوں کی تاریخی قدامت' معاشرتی' سماجی' معاشی اور ثقافتی ہر طرح کی سرگرمیوں جنگوں' معاشقوں رسوم و روایات کا ماٰخذ قدیم شاعری ہے۔ ادب کی کوئی اور صنف ماسوائے لوک کہانیوں کے اب تک اس دور کے حوالے سے دستیاب نہیں' اس لیے بلوچی ادب کے تمام خزائن اسی قدیم شاعری میں پوشیدہ ہیں جسے دورِ اول اور دورِ ثانی کے زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دورِ اول اپنی ابتدا سے اس عہد تک پھیلا ہوا ہے جبکہ مدرسوں سے عربی فارسی کی تحصیل کر کے شعراء نے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ چنانچہ پہلے دور میں معلوم شعراء کی صف میں شئے کلاں' شئے عیسیٰ' شئے مرید' بیبر گ رند مکران کے حکمرانوں میں جمل جیند گلمتی' میر قمبر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ حضرت مست توکلی نے ایک قطعہ میں ہمیں بتایا ہے کہ:-

آسے کلان ءَ بالتہ　　شئے عیسیٰ ءَ دھودھوکتہ
جام درک ءَ پُر پُھوکتہ　　ماپہ ہواڑاں نشتخوں

ترجمہ: یعنی شاعری کی آگ شئے کلاں نے سلگائی' شئے عیسیٰ اس کے دھوئیں کا مورد رہا۔ جام درک نے بجھی ہوئی آگ کی راکھ پھونک کر ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اس کے شعلوں پر ہاتھ تاپ رہے ہیں۔

قدیم شاعری کا حوالہ محض تسلسل برقرار رکھنے کے لیے دیا ہے۔ مکتبہ درخانی اور جدید دور کی ادبی مساعی و کاوشیں ہمارے موضوع سے متعلق ہیں جو بلوچی ادب کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں تک ایسے شاعر بقیدِ حیات تھے جو کہ بلوچی کی بجائے اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان میں سید ہاشمی' محمد حسین عنقا' عبدالصمد سربازی' میر گل خان نصیر اور کئی نامور بلوچ شعراء تھے۔ میر گل خان نصیر بھی ابتدائی زمانے میں اردو اور براہوی میں سخن سرا رہے۔ براہوی میں ان کی ایک مثنوی ''مشہد نا جنگ نامہ'' بہت سے اصحاب کی نظر سے گزری ہے۔ میر گل خان نصیر نے ایک ادبی انٹرویو میں جو انہوں نے ۱۹۸۲ء میں ماہنامہ زمانہ بلوچی کے مدیر کو دیا تھا' اس تبدیلی کی وجہ ایک سیاسی واقعے کو قرار دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ''پشاور میں سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا جس میں ملک کے طول و عرض سے چیدہ چیدہ سیاسی رہنما اور شعراء شامل ہوئے۔ جلسہ کے اختتام پر ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ ہر شاعر اپنی علاقائی زبان میں آ کر پڑھتا اور خراجِ تحسین وصول کرتا۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ میرے پاس بلوچی کلام نہیں تھا۔' اس روز میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ بلوچی ہی میں میرا اظہار ہوگا۔'' میر گل خان نصیر نے ۱۹۴۰ء کے بعد جو شاعری کی' وہ ۱۹۵۹ء میں گلبانگ کی زینت بنی۔ یہ بلوچی میں جدید ادب کی ابتداء ہے۔ اس سے پہلے بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی کے زیرِ اہتمام مولانا خیر محمد ندوی نے ایک ماہنامہ ''اومان'' جاری کیا تھا۔ جس میں اردو کے ساتھ کچھ نظم و نثر بلوچی میں بھی شائع کرتے۔ یہ وہ مضامین نظم و نثر تھے جو ریڈیو پاکستان کراچی سے ان کی سرپرستی اور نگرانی میں نشر ہوتے تھے۔ اومان کو بعض مالی دشواریوں نے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہنے دیا۔ تاہم بلوچی زبان کا ادب کئی سینوں میں مچلتا رہا۔

۱۹۵۶ء میں آزاد جمالدینی نے کراچی سے ماہنامہ ''بلوچی'' کا اجراء کیا۔ یہ رسالہ بھی بمشکل ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ مگر اس نے بلوچوں میں ذوق وشوق کو اس طرح مہمیز کر دیا کہ لکھنے والوں کی ایک قابل قدر جمعیت پیدا کی۔ ان میں شاعر بھی تھے' افسانہ نگار بھی' ڈرامہ نویس بھی اور دبے لفظوں سے تنقید کرنے والے بھی تھے۔ آزاد جمالدینی میں دو بڑے اوصاف تھے۔ وہ بلوچی زبان کی ترقی اور ترویج کو ایک طرح کی عبادت گردانتے تھے۔ خود اچھے شاعر تھے' نئے لکھنے والوں کی اصلاح اور اُن کی دل جوئی بھی کرتے تھے۔ کراچی میں ان کے علاوہ شعراء میں سعید ہاشمی' مراد ساحر' اکبر بارکزئی' قاضی عبدالرحیم صابر' قاسم ہوت' احمد زہیر' مراد و آورانی سخن گوئی کے میدان کے شہسوار بنے۔ جبکہ نثر نگاروں میں عبداللہ جان جمالدینی' محمد بیگ' سید ہاشمی' رفیق قادری' امان اللہ گچکی' میر شیر محمد مری' ملک محمد طوقی' اشرف سربازی' اور ملک محمد سعید نے بلوچی ادب کو نئے نئے مضامین اور موضوعات سے متعارف کرایا۔ ماہنامہ بلوچی بھی مالی مسائل میں مبتلا ہو کر ۱۹۵۸ء میں بند ہو گیا اور ریڈیو پاکستان کراچی کا بلوچی پروگرام ۱۹۵۹ء میں کوئٹہ منتقل ہوا۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس ادارے نے علاقائی زبان کی ترقی اور ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ایک ایک چراغ سے کئی چراغ روشن ہوئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ خوش قسمتی سے ۱۹۶۱ء میں محکمہ ٹرائیبل پبلسٹی نے بلوچی اور پشتو کی ضرورتوں کے تابع ''اُلس'' کے رسائل جاری کیے۔ بلوچی اُلس کی ادارت امان اللہ گچکی کو تفویض ہوئی۔ انہوں نے پبلسٹی کے ساتھ ساتھ اس میں ادبی رنگ آمیزی کی۔ اسی دوران بلوچی اکیڈمی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ یہ تین ادارے ایک دوسرے کی معاونت سے بلوچی ادب اور ترویج و اشاعت میں ہمہ تن مشغول رہے۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے جو کچھ نشر ہوتا' وہ اُلس کا مواد بنتا اور پھر بلوچی اکیڈمی سے کتابی صورت میں ادب کے سرمائے میں اضافے کا باعث بنتا۔

بلوچی زبان کے ادباء امان اللہ گچکی' بشیر احمد بلوچ' عطا شاد' کریم دشتی' صورت خان مری' پیر محمد زبیرانی' ملک محمد طوقی' میرزا طاہر محمد خان' ملک محمد پنا' میر محمد سردار خان' غوث بخش صابر' میر گلزار مری' عزیز محمد بگٹی' محمد خان مری' غنی پرواز' میر مٹھا خان مری اور بیسیوں دوسرے لکھنے والوں نے نہایت محنت اور ذوق وشوق سے اتنا کچھ لکھا کہ کئی سالوں تک ان اداروں کو مواد کی کمی کا شکوہ نہ رہا۔ بلوچی زبان میں نظم ونثر کے ساتھ ساتھ اردو' انگریزی میں بلوچی ثقافت' تاریخ بود و باش اور قدیم شاعری کے متعارف کرانے میں تحقیق وترویج میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر' انور رومان' کامل القادری کے نام نمایاں ہیں۔ یہاں ایک بار پھر بلوچی زبان کے محسنِ اعظم آزاد جمالدینی کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان کی معاونت سے جناب عبدالکریم شورش' نے ''نوکیں دور'' کا اجراء کیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار کم' میگزین زیادہ تھا۔ اسے مختلف اوقات میں بلوچی لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا۔ آزاد جمالدینی کے علاوہ کامل القادری' عطا شاد' صورت خان مری' اور غوث بخش صابر کی اس ہفت روزہ سے وابستگی رہی۔ جن لوگوں نے نوکیں دور کے خاص نمبر خصوصاً مکران نمبر دیکھا ہوگا' وہ تصدیق کریں گے کہ اس ہفت روزہ کا ایک علمی مقام تھا۔

سید فصیح اقبال کو بلوچی زبان سے بڑی محبت ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے متعدد مرتبہ اپنے عملی طور پر

بھی کیا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کراچی سے ''زمانہ بلوچی'' پندرہ روزہ کی شکل میں منظر عام پر آیا۔ تو فصیح اقبال صاحب کی زبان دوستی پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ زمانہ بلوچی کی ادارت جناب صدیق آزاد ظفر علی ظفر کے ذمے رہی۔ اس پندرہ روزہ کی تاریخی خدمات کو ہرگز بھلایا نہیں جا سکتا۔ کراچی سے کوئٹہ منتقل ہونے پر اس کی ادارت اشیر عبدالقادر شاہوانی کرتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں زمانہ بلوچی عبدالقیوم بلوچ کی صدارت اور سرپرستی میں کئی سالوں تک زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ بلوچی رسائل و جرائد کے زمرے میں مولانا خیر محمد ندوی کے ''بوغات'' مولانا نور احمد فریدی اور چاکر خان بلوچ کے ''بلوچی دنیا'' ممتاز یوسف کے ''آساب'' غلام فاروق کے ''بلوچی لبزانک'' زندمان' چراگ اور چاگرد نے قابل لحاظ ادبی مواد فراہم کیا۔ جب بھی بلوچی زبان و ادب کی تاریخ رقم ہوگی' ان باوقار رسائل اور جرائد کے حوالوں کے بغیر مکمل نہ ہوگی۔

بلوچی زبان اور ادب کی خدمت کے ضمن میں کوئٹہ سے ''بلوچی'' کے دور ثانی اور دور ثالث کی خصوصی اہمیت ہے۔ ۱۹۷۸ء میں آزاد جمالدینی نے ''ماہنامہ بلوچی'' کے بار دوم کا اجراء کیا۔ پیرانہ سالی اور وسائل کے فقدان کے صبر آزما مراحل میں بھی آزاد جمالدینی نے ہتھیار نہیں ڈالے اور اسی رسالے کی زندگی اور بقاء کے لیے اپنی زندگی وقف رکھی۔ آزاد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہمفام قوم پرست اور زبان دوست عبدالواحد بندیگ نے ''بلوچی'' کو جاری رکھا۔ اور گذشتہ چودہ سالوں سے زبان و ادب کی خدمت میں یہ واحد رسالہ ہے جو سرفروشانہ میدان عمل میں موجود ہے۔ بلوچی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں بلوچستان اور صوبہ سندھ کے کراچی سے متعدد ادبی اداروں نے اپنی بساط بھر خدمت کی ہے۔ اس کی ابتدا بلوچی اکیڈمی کراچی سے ہوئی۔ کراچی کی ادبی شخصیات میں اکبر بارکزئی' مراد ساحر' شیر محمد مری' محمد زبیر' محمد بیگ کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ اہل حکم کی جبین کی شکنوں کو خاطر میں نہ لا کر ان زبان دوستوں نے اس ادارے کی جانب سے بلوچی میں کتابیں چھاپیں' گیت لکھے' میدان ادب میں لکھنے والوں کو موقع دیتے رہے۔ وسائل کی عدم دستیابی بلوچی زبان و ادب کا ہمیشہ سے مقدر رہی۔ اسی فقدان نے بلوچی اکیڈمی کراچی کو ایک اور جنم لینے پر مجبور کیا۔ ۱۹۶۱ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کا قیام عمل میں آیا۔ بلوچستان کی اس وقت کی حکومت نے ایک حقیری رقم سالانہ منظور کی مگر بلوچی زبان و ادب کے سپاہیوں نے اس محاذ پر پسپا ہونا نہیں سیکھا تھا۔ محمد سردار خان گشکوری' حاجی عبدالقیوم بلوچ' بشیر احمد بلوچ' طاہر محمد بلوچ' صورت خان مری' عزیز بگٹی' عطا شاد' ملک محمد پناہ' پیر محمد زیرانی' محمد مری' میر گلزار خان' حاجی محمود مومن بزدار' غوث بہادر اور کئی دوسرے اہل قلم نے اس ادارے سے وابستہ رہ کر بلوچی زبان و ادب کے ذخیرے میں شایان شان اضافہ کیا۔ ہر موضوع پر کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ بلوچی زبان ادب ثقافت اور تاریخ پر لامتناہی تحقیق و تسوید کا سلسلہ جاری ہے۔ اب اس ادارے کے فنڈ میں حکومت بلوچستان نے اضافہ بھی کیا ہے اور اس ادارے سے دو سو سے اوپر کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بلوچی زبان کی ڈکشنری بھی سائنٹیفک طریقے سے چھاپی جا رہی ہے۔

کراچی میں قائم ادبی اداروں کی فہرست بھی حوصلہ افزا ہے جہاں سید ہاشمی اکیڈمی، فاضل اکیڈمی، بلوچی ادبی بورڈ، آزاد جمالدینی اکیڈمی اور بلوچی ادبی پٹ پولی انجمن کئی اور ادارے مصروفِ عمل ہیں جبکہ بلوچستان میں خضدار کے مقام پر رابعہ خضداری اکیڈمی، مکران میں تربت فاضل اکیڈمی، بلوچستان اکیڈمی کیز انگی سرچمگ اور پنجگور میں عزت اکیڈمی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں سرگرمِ عمل ہیں۔ اداروں کے ذکر میں دو تین لکھنے والوں کی کاوشوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ اگرچہ وہ تنہا افراد تھے اور ہیں مگر انہوں نے اداروں سے بھی بڑھ کر کام کیے اور بلوچی زبان وادب کی کسی جہت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بلوچی زبان وادب، سید ہاشمی، میر گل خان نصیر، میر مٹھا خان مری، غوث بخش صابر کی خاموش خدمات سے گراں بار ہے۔ سید ظہور شاہ ہاشمی جب تک وطن میں رہے، بلوچی زبان وادب کے ایک گھنے درخت کی مانند تھے۔ اپنی صحت، اپنی زندگی، اپنے گھر والوں کا خیال کیے بغیر جس قدر اثاثہ پایا، ادب کی خدمت میں لٹایا۔ کیا شاعری، کیا نثر، کیا نصاب ہر طرح سے بلوچی ادب کو مالا مال کیا ان کی تصانیف وتالیفات اور ان سب پر مستزاد، "سید گنج" لغات کہ اس گنجینۂ ادب کے منظرِ عام پر آنے کے لیے اہلِ نظر منتظر تھے، اب وہ مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ میر گل خان نصیر ایک اور نابغۂ روزگار تھے کہ تاریخ، سیاست، ثقافت، اشعار، ادب، فکر وفن کے شعبہ کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ سید ہاشمی تپ دق کے موذی مرض سے نبرد آزما رہے۔ میر گل خان نصیر زندان کی صعوبتوں کا شکار، مگر تخلیق وتحقیق دونوں کا شعار۔ ابھی نہ جانے اور کتنے گنج ہائے گراں مایہ میر گل خان نصیر کے خزینے میں منتظرِ اشاعت ہیں۔ یہی حال میر مٹھا خان مری کا ہے کہ انہوں نے خرابۂ ہستی کا سینہ کرید کر مست توکلی، رحم علی، اقبال اور رفتگانِ شعر وادب کو بلوچی اور اردو میں روشناس کرایا۔ غوث بخش صابر نے اب تک ۳۷ کتابیں بلوچی زبان وادب کے ذخیرے کو بخشی ہیں۔ عطا شاد، صورت خان مری، بشیر احمد بلوچ، آغا نصیر، میر شیر محمد مری، ملک طوقی، پیر محمد زبیرانی، حاجی عبدالقیوم بلوچ، الفت نسیم، مبارک قاضی، حاجی عنایت اللہ قومی، بشیر بیدار، پروفیسر صبا دشتیاری، غنی پرواز، غوث بہار، فقیر محمد عنبر، فضلِ خالق غرض کہ سینکڑوں قابلِ احترام نام ہیں جن کے روشن کیے ہوئے چراغ بلوچی ادب کے مستقبل کی راہ روشن کیے ہوئے ہیں۔ ان میں خواتین کا نام نہ لینا ناانصافی ہوگی۔ گوہر ملک، بلوچی افسانہ نگاری طنز ومزاح اور تراجم میں کام کر چکی ہیں۔ بانل دشتیاری نے کالم نویسی، انشائیہ اور طنز ومزاح پر مضامین لکھے ہیں اور خود شاعرہ بھی تھیں۔ بلوچی تحقیق میں خواتین میں پہلی بلوچی ایم اے، ایم فل، اور PhD کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہے۔ اس کے علاوہ طروتی بخاری ترجمہ کرتی ہیں۔ ذکیہ سردار کی کتاب سرمست بلوچستان، بشریٰ قیوم طاہرہ بلوچ، راشدہ بلوچ، صبیحہ مینگل، ماجبین بلوچی شاعری کے علاوہ مضامین بھی لکھتی رہتی ہیں۔ عین عین دشتی کو افسانہ نگاری پر دسترس تھی۔ لیکن ایک اہم بات یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ بلوچ مرد خواتین کے لیے مونث ناموں سے بھی لکھتے تھے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے آنے سے ڈرامائی ادب کو جو داستانوں کی وجہ سے پہلے بھی ایک صنف کے طور پر سینوں میں جاگزیں تھا۔ مزید تقویت ملی، اس صنف کو عطا شاد، عبدالحکیم بلوچ، امان اللہ گچکی، عبدالخالق بلوچ،

منیر احمد بادینی نے چار چاند لگائے۔ الیکٹرانک میڈیا بھی بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ خصوصاً حال ہی میں ۱۴ اگست سے پی ٹی وی بولان کے نام سے چینل کا افتتاح وزیر اعظم پاکستان نے کیا ہے۔ اس میں ڈراموں کے ساتھ ساتھ ادبی بحث ومباحثے اور دوسرے موضوعات پر مبنی گفتگو بھی شامل ہے۔ جس سے یقیناً مستقبل میں مثبت تبدیلی کے امکانات روشن ہوں گے۔ جبکہ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی، غوث بہار، غنی پرواز، منیر احمد بادینی، منیر عیسیٰ، صورت خاں مری، میر عبداللہ جمالدینی نے افسانوی ادب کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ بلوچی ادب اپنے پچاس سال پورے کر چکا ہے۔ جناب میر عاقل خان مینگل کی تحقیق وتنقید، کریم دشتی کے جواہر ریزے واد بزدار، غنی پہوال، عابد آسکانی، محمد بیگ بلوچ، کے تنقیدی مضامین اور دوسرے نقادوں کی رہنمائی بلوچی ادب کے حق میں نہایت نفع بخش ثابت ہو رہی ہے۔ مزید اکیڈمک حوالے سے بلوچی زبان وادب کو C.S.S. میں ایک امتحانی پرچے کی حیثیت حاصل ہے۔ بلوچستان بورڈ میں سکولوں میں دو پرچے مڈل کے امتحان میں اور نویں اور دسویں کلاس میں تقریباً دو سو نمبروں کے پرچوں کا اجراء زبان وادب کی ترقی کا باعث بنا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچی فاضل ادیب اور عالم کے امتحانات اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ زبان کی ترقی میں ان امتحانوں کا ہونا بہت اہم ہے۔ بلوچی فاضل پاس کرنے والے کو B.A میں صرف انگلش اور پاک سٹڈیز کا پرچہ پاس کرنے پر گریجوایشن کی ڈگری دی جاتی ہے۔ B.A میں مزید بلوچی آپشنل کا پرچہ ڈویژن کو بہتر بنانے کے لیے بھی رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کالجوں میں B.A Elective میں دو سو نمبر کے دو بلوچی پرچے B اور A ہیں۔ 1996ء میں سابقہ گورنر بلوچستان نواب محمد خان بگٹی کے دور میں پرائمری کی سطح پر بلوچی زبان میں پڑھانے کا رواج ہوا جو کہ تقریباً دو سال تک جاری رہا۔ لیکن بعد میں اسے بند کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اگر اس وقت تک یہ جاری رہتا تو تقریباً مڈل پاس سٹوڈنٹ آگے کی تعلیم کو بہتر طریقے سے حاصل کر سکتے تھے۔ بہر حال یہ ہمارے صوبے کی بدقسمتی ہے۔ یا ہمیں سیاست دان ایسے ملتے رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم عوام کے لیے تعلیم پر خرچ کی مقدار یہاں آٹے میں نمک کے برابر رہی ہے اور زبانوں سے ہمیشہ نفرت ان کے دلوں میں جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے تو خان قلات کے دربار اور دفتر کے کھاتوں کی زبان فارسی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ان پچاس سالوں میں جتنا کام بلوچی زبان وادب میں ہو چکا ہے۔ خانی دور میں ان تین سو سالوں میں اگر فارسی کی بجائے بلوچی زبان کو درباری اہمیت دی جاتی تو اس زبان کی شناخت شاید صوبائی کی بجائے قومی اور انٹرنیشنل ہوتی۔

---☆☆---

منیر مومن

بلوچی سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

رومال

میں نے بہت کوشش کی کہ اُس کے جنازے کو کاندھا دوں، لیکن ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ میں ان کی میت کو کاندھا نہ دے سکا۔ وہ بہت مشہور شخص تھا اور لوگوں میں پُرفکر اور پُرمغز گفتگو کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ آج اس کی میت کو لے جانے اور جنازہ پڑھنے تک لوگ اس کی ایمان داری اور خوبیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اُس نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ یہ شخص بے ایمانیوں کی ایک کھلی کتاب تھی، وگرنہ تم لوگ بہت سی ایسی چیزوں کے بارے میں بھی نہیں جانتے، جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ مگر میں کہ تمھارے سامنے ہوں، لیکن تم مجھے نہیں جانتے، کیوں کہ اس صاحبِ ایمان نے اپنی کسی کہانی کی شہ سرخیوں میں میرا نام نہیں لکھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ صاحب بڑے کہانی کار تھے اور انھوں نے اپنا جو بھی کردار تخلیق کیا، اسے زندہ و جاوید بنا دیا، مگر اس میں آپ کا قصور نہیں ہے، کیوں کہ مجھ سے آپ کی شناسائی نہ ہو سکی۔ میں نے اُسے اپنی ہر کہانی میں تحریر کیا اور ہر جگہ اسے مطعون کیا۔

میں ایک دفعہ ہوٹل میں چائے پی رہا تھا تو میں نے اُسے دیکھ کر پہچان لیا لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں نے چاہا کہ اُس کی تنہائی میں مداخلت نہ کروں مگر چند ثانیے بعد میں نے دیکھا کہ اُس کی تنہائی میں ایک مکھی مخل ہوئی اور چائے کے قطرے اس کے دامن پر گرے۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اُسے تھما دیا کہ وہ چائے کے دھبے صاف کرے۔ اُس نے چائے کے دھبے صاف کر کے رومال اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ جناب تم مجھے جانتے ہو، اُس نے کہا نہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُن کا ایک کردار ہوں اور میرا نام گُل محمد ہے۔ کچھ سوچنے کے بعد اُس نے کہا لگتا ہے کہ میں نے اب تک تجھے تحریر نہیں کیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے اب میں زینب کے بارے میں لکھنے کا سوچ رہا ہوں۔ کچھ توقف کے بعد کہنے لگا، زینب کو میں نے کل دیکھا تھا اور اُس کی مسکراہٹ میں، میں نے اپنی کہانی

تلاش کر لی تھی۔ وہ نہایت ہی زخم خوردہ تھی، اور اگر میں بہت جلد اس کی کہانی کو تحریر نہ کروں تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر جائے اور اس کی مسکراہٹ متاثر ہو جائے۔

میں نے عرض کیا کہ جناب ایک زینب کی کہانی تو تم نے بہت پہلے لکھی تھی، وہی زینب کہ جس کی پیاس نے اپنے پیر دریا میں جھونک دیے تھے۔ نہیں، وہ کوئی اور تھی، اُس کے آنسوؤں نے میرا سکون غارت کر دیا تھا اور وہ کہانی میں نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ خوف زدہ ہو کر تحریر کی تھی۔

دورانِ گفتگو میں نے اسے یاد دلایا کہ میرا رومال اُس کی جیب میں ہے، تو کہانی کار نے کہا کہ تمھارا کا رومال میری جیب میں رہے تا کہ میں تجھے لکھنا نہ بھول پاؤں۔

دوسری بار میں نے اپنے کہانی کار کو پورے پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ بہت سے تخلیق کار اور قلم کار اُس کے اردگرد جمع تھے۔ وہ بول رہا تھا جب کہ دوسرے ہمہ تن گوش تھے۔ میں بھی اُن کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کسی ایک نے اُن سے دریافت کیا؛ حضور! آپ کہانی کا آغاز کہاں سے اور کیوں کر کرتے ہیں۔ اُس نے جواب میں کہا کہ میں وہیں سے کہانی کا آغاز کرتا ہوں، جہاں پر کہانی کا اختتام ہوتا ہے۔

پھر اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور کچھ توقف کے بعد اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اُس نے کہا؛ میرے کردا مجھ سے خفا ہیں کہ میں انھیں تحریر نہیں کر رہا ہوں، لیکن انھیں خبر ہی نہیں ہے کہ میں نے کہاں کہاں انھیں تحریر کیا ہے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ صرف کتابوں میں لکھی ہوئی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ہواؤں کے سرہانے کتنے مقبرے ہیں کہ جہاں ہم نے اپنے زندہ کردار بٹھا رکھے ہیں۔ کتنی کہانیاں، سُوئی سے قمیصوں کے گریبانوں اور رومال کے کناروں پر کشیدہ کی گئی ہیں۔ ہواؤں اور پانیوں نے انھیں پڑھ رکھا ہے، حتیٰ کہ ان کے نقوش بھی اب دھندلا گئے ہیں، مگر لوگ ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں ہے۔

بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے، اُس نے ایک نوجوان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا؛ وہ مرغ جو تمھاری آنکھوں میں محوِ پرواز ہے، وہ بھی میرا ایک کردار ہے۔ وہ خواب جس کے لیے تُو نے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کی تھیں، کل رات اپنی کہانی سُنانے کی خاطر میرے یہاں آیا تھا مگر میں نے اپنے دیے کی لَو کو اونچا رکھا۔ بھلا ایک اکیلا کہانی کار کس کس کی دل آزاری کرے اور کتنوں کو خوش رکھے۔

کچھ دیر کے لیے اپنی گفتگو کو معطل کرتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور پسینہ پونچھ لیا۔ اُسی دن سے میں اپنے وجود اور اپنے کہانی کار ہر دونوں سے فراموش ہو گیا تھا مگر آج اچانک جب مجھے

اس کے مرنے کی خبر ملی تو میں قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ تمام لوگ افسردہ اور مضمحل تھے۔ لوگوں کی باتوں اور آنسوؤں کے درمیان فقط مرحوم کے کفن کا سوراخ نمایاں تھا۔

مرحوم کے کفن دفن کے بعد تمام لوگ واپس آ گئے تھے، صرف مرحوم کا بیٹا اُس کی قبر کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا اور میں اُس سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مرحوم کا بیٹا جیب سے رومال نکال کر آنسوؤں کو پونچھنے لگا تو میں اور بھی قریب ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ رومال کے کنارے پر سیاہ دھاگوں سے زینب کا نام کاڑھا ہوا تھا۔ میں پیچھے مُڑا۔۔۔ اس سے زیادہ بے ایمانی۔۔۔ منافقت۔۔۔ بخیلی اور کیا ہو سکتی ہے۔

☆☆☆☆

15

منیر احمد بادینی

بلوچی سے ترجمہ: شرف شاد

دہشت

بس چلنے لگی تھی مگر پھر دھیرے دھیرے رُک گئی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا ایک مسافر دُور سے لمبے ڈگ بھرتا بس کی طرف آ رہا تھا۔ شاید ڈرائیور نے اُسے دیکھا ہو تو اُس کے لیے بس روک دی ہو۔ اوپر آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور بس کے روانہ ہونے سے کچھ لمحے پہلے بوندیں بھی پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ مجھے خوف نے آگھیرا۔ اگر یہ بارش اس طرح برستی رہی تو اپنی منزل پر پہنچنا میرے لیے ناممکن ہوگا۔ کیوں کہ میں وادی کے گاؤں اور اس کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کتنے ندی نالوں سے ہوتا ہوا ایک کچّا راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہُوا وادی تک جاتا تھا۔ برسات کے موسم میں یہ راستہ کبھی کبھی ہفتوں تک بند رہتا تھا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ خُدا وسیلہ ساز ہے۔ یہ بارش جو خاران زور زور سے برس رہی ہے، شاید وہاں وادی میں ہو ہی نہ رہی ہو، کون کہہ سکتا ہے؟

جنوری کے آخری دن تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ مسافروں نے گرم پوشاکیں پہنی ہوئی تھیں۔ بس کی حالت بھی ایسی تھی کہ اس کی ایک بھی کھڑکی یا دروازہ اس حالت میں نہیں تھی جہاں سے سرد ہوا اندر نہ آتی ہو۔

وہ شخص جس کے لیے بس رکی تھا اب بس میں داخل ہو کر اپنے جسم کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹتا مختلف سیٹوں کے سرہانوں پر ہاتھ رکھتا ہوا آ کر میرے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ بس کی یہی ایک سیٹ خالی تھی جس پر میں اکیلے بیٹھا تھا۔ اُس کے وہاں بیٹھنے سے مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ سفر میں کوئی بات چیت کرنے والا مل گیا تھا۔

وہ ایک جوان آدمی تھا اور ڈیل ڈول سے صحت مند اور طاقتور دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے تمام بال داڑھی سمیت کالے تھے۔ البتہ اُس کی داڑھی کچھ لمبی تھی شاید کافی مُدت سے اُسے بنانے کا اُسے موقع نہ ملا ہو۔ اُس کے کمبل اور کلائی میں بندھی گھڑی سے لگ رہا تھا کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنی خُو بُو سے وہ خاموش اور منکسر المزاج دکھائی دیتا تھا۔ جیسے بیٹھتے وقت اُس نے مجھ سے پوچھا تھا آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے۔؟ اُس کا یہ کہنا مجھے اس لیے کھٹکا کہ کہیں میں خود اُس شریف آدمی کے لیے باعثِ تکلیف تو نہیں ہوں.....!

جب بس روانہ ہُوئی تو اُس نے اپنے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا۔ اپنی بڑھی ہوئی

داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ شاید بارش کا نظارہ اُسے پسند نہیں تھا۔ دوسروں سے بات کرنا بھی۔ اس لیے میں نے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

جب بس تین چار گھنٹے سفر کے بعد مین روڈ کو چھوڑ کر وادی کے کچّے راستے پر اُتر گئی تو ایک ایک کر کے بس کے بہت سے مسافر راستے میں آنے والے دیہاتوں میں اُترتے گئے۔ اب بس میں قصبے کے اکّا دکّا مسافر رہ گئے تھے۔ اُس کو بھی شاید وہاں تک جانا تھا جس کا اُس نے ابھی تک اظہار نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ آگے کسی گاؤں میں اُتر جائے کیوں کہ وادی ابھی کافی فاصلے پر تھی، بہت سے ایسے مسافر تھے جنھیں پہلے اُترنا تھا شاید ان میں وہ بھی ہو۔ میں دیکھ رہا تھا وہ کہاں اُترتا ہے؟

میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اُس کے پاس کوئی سامان نہ تھا سوائے ایک کمبل کے۔ کوئی بیگ نہ بستر نہ کوئی گٹھڑی وغیرہ۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ ڈیل ڈول اور اپنی حرکتوں سے اس علاقے کا نہیں لگ رہا تھا، کیوں کہ محکمہ تعلیم میں اپنی ملازمت کے ان چھے مہینوں میں، میں وادی کے تمام تر لوگوں سے واقف تھا۔ وہ سب غریب اور نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ یہ شخص جو میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اُن سے الگ تھا، لیکن وہ وادی میں کیوں جا رہا تھا؟

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ وہاں نوکری کے سلسلے میں جا رہا ہو، لیکن وادی میں سرکاری نوکری بس ایک ہی تھی، وہ تھے مڈل سکول کے دو ٹیچر جن میں ایک وادی کا مقامی باشندہ تھا جو پرائمری سیکشن میں پڑھاتا تھا اور دوسرا سرکاری ملازم خود میں تھا اسی سکول کا ہیڈ ماسٹر۔ قلات سے میری پوسٹنگ چھے مہینے پہلے اُس وقت یہاں ہوئی تھی جب قصبے کے پرائمری سکول کو اپ گریڈ کر کے مڈل سکول بنایا گیا تھا۔ تین چار مزید پوسٹیں ابھی تک خالی تھیں جن کے لیے کوئی بھی وادی میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خود میرے لیے بھی وادی ایک قید خانہ تھا لیکن بحالتِ مجبوری میں اپنے شب و روز گزار رہا تھا۔ اس لیے میں سمجھ نہیں سکا یہ آدمی وادی میں کیوں جا رہا ہے؟

بوندیں اب بھی برس رہی تھیں لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ ہلکی تھیں۔ ہلکی بارش سے پہاڑوں کا پانی دیر سے آتا تھا اس لیے راستہ بند ہونے کا خطرہ کم تھا۔

ایک دو مسافروں کے اترنے کے بعد اب بس کی آخری منزل قصبہ تھا، جہاں کے صرف تین مسافر رہ گئے تھے، میں، وہ شخص، اور ایک دکان دار، جو میری جان پہچان والا تھا۔ وہ گاؤں کی اکیلی دکان کا مالک تھا۔

سورج غُروب ہو رہا تھا لیکن بادلوں کے گھیرے میں تھا۔ پہاڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اچانک جب ہماری بس ایک اُترائی میں اُتری تو ایک پھیلا ہوا میدان چھوٹی پہاڑیوں اور خالی زمین سمیت ہمارے سامنے تھا جو بارش کے غُبار میں تاریک دکھائی دے رہا تھا ہم جان نہیں سکتے تھے کہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟

بس دندناتی ہوئی میدان کو پار کر کے پہاڑیوں اور ریت پر مشتمل وادی کے قصبے میں پہنچ گئی۔ سکول

کے سامنے اپنے اڈّے پر رُک گئی۔ دکان دار نے ہم سے ہاتھ ملایا اور اپنی راہ لی۔ سکول کا چپراسی میرا سامان سمیٹنے لگا۔ وہ شخص جس نے چُپ شاہ کا روزہ رکھ ہوا تھا میرے ساتھ ہی اُتر گیا اور میں حیرت میں پڑ گیا کہ وہ کہاں جائے گا۔ کس کا مہمان ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟

جب میں سکول کی چار دیواری میں داخل ہُوا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ سکول کے تین کمرے تھے۔ دو کمروں میں کلاسیں لگتی تھیں۔ تیسرا میرے تصرّف میں تھا۔ ٹیچروں کی رہائش کے لیے الگ کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں اسی کمرے میں گزارا کر رہا تھا جو دراصل سکول کا اسٹور تھا۔ اب جو وہ نامعلوم آدمی میرا مہمان تھا تو اُسے بھی اسی کمرے میں جگہ دینی تھی۔ سکول کے چپراسی عرض محمد نے میرے سامان اور راشن کمرے کے ایک کونے میں رکھے۔ آتش دان میں آگ سُلگائی۔ لمحہ بہ لمحہ کُہر اور سردی کا زور بڑھ رہا تھا۔ آگ کمرے کے ماحول کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ عرض محمد نے لالٹین جلا کے انگیٹھی کے اوپر رکھ دی۔ میرا مہمان، اجنبی خاموشی سے آگ کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس کی نظریں مسلسل آگ کے شعلوں پہ لگی ہوئی تھیں۔ عرض محمد کبھی اُسے دیکھتا اور کبھی مجھے۔ شاید وہ مجھ سے جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، اور کہاں سے آ رہا ہے۔ لیکن پھر وہ کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ کوئی موقع نہیں تھا کہ میں مہمان کے بارے میں اُسے بتاتا تھا۔

میں نے عرض محمد سے کہا کہ وہ مہمان کے لیے مُرغی کا انتظام کرے اور چاول بھی پکائے تاکہ ہم اُسے ایک اچھا کھانا کھلا سکیں۔

جب میں باہر کے کاموں سے نپٹ کر آیا تو آتش دان کے سامنے بیٹھ گیا جہاں عرض محمد دیگچی چھڑائے ہوئے تھا اور ہم دونوں (مہمان) اُسے دیکھ رہے تھے۔ دیگچی کے ایک کونے میں عرض محمد کیتلی بھی رکھے ہوئے تھا۔ وادی کے علاقوں پر اب رات کا خیمہ بادلوں کے ساتھ پوری طرح تنا ہوا تھا اور موسلا دھار بارش اب بھی جاری تھی۔

چائے پینے کے بعد عرض محمد نے دیگچی اُتاری اور روٹی پکانے کے لیے گاؤں چلا گیا۔ سکول کی عمارت گاؤں سے ذرا فاصلے پر تھی۔ جہاں عرض محمد کا گھر تھا۔ وہ روٹیاں گھر میں پکواتا تھا۔ جب عرض محمد چلا گیا تو لپکتی آگ کی روشنی میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا: ''تم کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟''

وہ پہلی بار مجھ سے نظریں ملانے کے بعد مسکرا کر کہنے لگا ''آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں، چھوڑو ان باتوں کو، بس میں تمھارا مہمان ہوں۔''

''لیکن یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔'' میں نے کہا ''میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ واضح ہو.....

راستے میں بھی تم چُپ رہے اور میں نے بھی پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تم ایک مسافر تھے اور ہم دونوں کو اپنی اپنی راہ لگ جانا تھا۔ اس لیے سوال جواب کا سوال پیدا نہیں ہونا تھا جب مجھے معلوم ہوا تمھیں اپنی منزل کی

خبر نہیں ہے اور تم میرے ساتھ ہی چلے آئے تو صاف بات ہے کہ میرے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات تو اُٹھنے ہی ہیں؟.....'' میں نے کم ہوتی آگ کی تپش کو بڑھانے کے لیے کچھ کوئلے آتش دان میں رکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ ''طور طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم اس علاقے سے نہیں ہے، میرے سوالوں کے تسلّی بخش جواب تمھارے پاس ہیں؟..... میں یہ سب کچھ اس لیے جاننا چاہتا ہوں تا کہ میں سکون کی نیند سو سکوں۔ اگر میں جان نہیں پایا تم کون ہو، کہاں جا رہے ہو تو میں ٹھیک طرح سو نہیں پاؤں گا۔

''ان سب چیزوں کو جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟'' اُس نے ایک اور سگریٹ جلایا اور کہنے لگا۔ ''لیکن میرے لیے یہ اطمینان بخش بات ہے کہ میں تمھارے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں کیوں کہ آپ ایک ٹیچر ہیں' اور میں ٹیچروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں..... ایک ٹیچر کا مہمان ہونا میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے!''

''میں تمھیں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنا پہلا سوال دُہرایا۔

''کیا کرو گے جان کر..... آدمی جتنا جانتا ہے، اتنا ہی اپنے آپ کو خراب کرتا ہے۔ پریشان کرتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اپنے بارے میں بات کروں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خود سمجھ لیں کہ میں کون ہوں..... اب میں تمھارا مہمان ہوں تو آنے والے دنوں میں تم کو سب پتہ چل جائے گا۔.....'' اُس نے سگریٹ ختم کرنے کے بعد آتش دان میں پھینک دیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے وہ جواب کا منتظر ہو اور مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی جس میں نہ صرف شرافت اور سادگی تھی بل کہ اس میں فکر اور تعقل بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اُس کی شخصیت نے مجھے بُہت مُتاثر کیا۔ لیکن مجھے اُس کا بغیر کسی سبب کے گھر سے نکلنا اور کسی انجان آدمی کا مہمان بننا بہت عجیب لگ رہا تھا۔ میں اس راز کی تہہ تک پہنچنے کا خواہاں تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص اپنے گھر سے نکلے اور اُسے اس کا پتہ بھی نہ ہو وہ کہاں جا رہا ہے۔ اگر یہ سب ایک اسرار نہیں تھا تو کیا تھا پھر وہ بھی ایک ایسے شخص سے یہ سب کچھ سرزد ہونا، جو میرے نزدیک عقل اور شعور کا ایک پیکر نظر آ رہا تھا، یہ سب کچھ میری فکر اور سوچ سے بالاتر تھا۔ میں اس راز سے ہر حال میں پردہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ مہمان بھی اتنا اچھا تھا کہ بار بار اس کو تنگ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ کیا سوچے گا کہ میں اُس سے اتنا کیوں پوچھ گچھ کر رہا ہوں..... اس لیے میں نے سوچا، وہ میرے ہاں ہی ٹھہرا ہُوا ہے کل صُبح یا شام کسی وقت اس راز سے پردہ اُٹھ ہی جائے گا۔؟

عرض محمد نے کھانا لگا دیا تو میں نے مہمان کے ساتھ کھانا کھایا۔ اُس نے میرا شُکر یہ ادا کیا اور میں نے اُس سے کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں کیوں کہ اپنے مہمانوں کی خدمت کرنا ہماری روایت میں شامل ہے۔

میں نے اُس کے لیے بستر لگایا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جب کہ میں کمرے کے دوسرے کونے پر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ بارش برس رہی تھی۔ دور گاؤں میں کُتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی اور اندھیرے کمرے میں مہمان کے بارے میں سوچتے ہوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صُبح مہمان اُٹھا تو میں نے اُس کے ساتھ ناشتہ کیا اور سکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ بارش رُک چکی تھی۔ بادل دُور دُور بکھر گئے تھے کہیں کہیں نیلا آسماں نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی انھی ہلکے ہوتے بادلوں میں سورج جھانکتا تھا اور دُور گاؤں کے اُداس گھر، فصیلیں اور جھونپڑیاں یوں نظروں میں واضح ہو جاتیں جیسے کوئی طاقتور کیمرے سے ان کا کلوزاپ شاٹ لے! سکول کے بچے بہتی ناک اور چمکتے چہروں کے ساتھ سکول میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے مہمان سے اجازت لی اور دوپہر تک بچوں کے ساتھ مشغول رہا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ساتھ کھایا۔ بادل ایک بار پھر چھا گئے تھے لیکن اس کے ساتھ گورپیچ (موسمِ سرما میں چلنے والی سرد ہوا) کا ایک جھونکا آیا اور سارے بادلوں کو روئی کی طرح بکھیر کر پہاڑوں کے اُس طرف لے گیا اور چاروں طرف صرف اور صرف گورپیچ کا راج ہو گیا۔ جس کا چلنا ایسے تھا جیسے کوئی اُسترے سے بدن کے گوشت چھیلے۔ ہم دونوں شام تک آتش دان کے سامنے بیٹھے رہے۔ پھر ہم باہر نکلے۔ سکول کے سامنے ٹیلوں کا ایک لامختتم سلسلہ تھا۔ جو حدِّ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ انھی ٹیلوں پر ریت آ کر جم جاتی جس سے وہ ریتوں کے نیچے دب جاتے۔ سورج کی روشنی میں رات کی بارش سے بھیگی ریت اب خُشک ہو رہی تھیں جن کے نیچے دبے ہوئے ٹیلے چمک رہے تھے۔ مہمان اپنی شال اوڑھے، مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ جب ہم سکول کے سامنے ایک بڑے ٹیلے پر پہنچے تو اُس نے اپنے سگریٹ کو پاؤں کے نیچے مَسلتے ہوئے میری جانب دیکھا اور شائستگی سے کہنے لگا: ''آپ کل سے مسلسل پوچھ رہے ہیں کہ میں کون ہو، کہاں جا رہا ہوں؟ آیئے میں آپ پر سب واضح کرتا ہوں..... یہ مناسب بھی نہیں ہے کہ میں آپ کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ آپ کا کھانا کھا رہا ہوں، اور آپ کو پتہ بھی نہ ہو کہ میں کون ہوں؟..... دراصل کچھ عرصے سے مجھے احساس ستا رہا تھا کہ میں کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں مجھے زندگی کا کوئی خوف کوئی دہشت دامن گیر نہ ہو۔

بچپن سے ایک دہشت میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ آپ اسے خوف نہیں کہہ سکتے، یہ خوف سے کچھ زیادہ ہی طاقتور شے ہے۔ خوف میں، آپ ایک بیرونی علت سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو آپ بیرونی علتوں کو غلط معنی دیتے ہیں اور خوف تمھارے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ الگ ہے۔ یہاں آپ زندگی سے ایسا خوف محسوس کرتے ہیں۔ جیسے یہ آپ کو کھا رہی ہو۔ تمھیں نگل رہی ہو۔ ہڈّیوں اور گوشت میں چھید ڈال رہی ہو۔ یہ ایک نہایت ہی عجیب احساس ہے۔ جب ایک بار آدمی اس کے شکنجے میں پھنس جائے تو وہ، پہلے جیسا نہیں رہ سکتا۔ اُس کے لیے دوسرے تمام احساسات ہیچ ہو جاتے ہیں۔ سوائے اسی ایک دہشت کے احساس کے..... پتہ نہیں مجھ سے کیا گُناہ سرزد ہوا ہے کہ زندگی کی دہشت نے مجھے شکنجے میں کس لیا ہے۔ شاید میرا خمیر کچھ اس طرح کا ہے کہ میں زندگی کو ایک الگ نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ حساس ضرور ہوتے ہیں۔ مگر اپنی انا کو خراب نہیں کرتے کہ وہ زندگی کو ایک دہشت سمجھیں۔ وہ خود کو حساس ظاہر کرتے ہیں لیکن اصلاً ہوتے انا پرست ہیں جب کہ زندگی کی دہشت سے

دوچار ہونے کے بعد آپ الگ راہ لگ جاتے ہیں جس میں کوئی انا پرستی نہیں ہوتی۔ زندگی تم کو ایک خوف میں مبتلا کرتی ہے، اور تم مجبوراً اس کی ہر چیز کو الگ ڈھنگ سے دیکھنے لگتے ہو..... اس کا مطلب ایک انا پرست کا حساس ہونا نہیں ہے۔ بل کہ اس میں زندگی کے معنی پوشیدہ ہیں..... میرے مطابق اگر کوئی زندگی کی دہشت سے واقف ہے تو وہ خود زندگی سے واقف ہے۔ اگر وہ اس کے بارے میں نہیں جانتا تو وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ حساس ہونا، خوف میں مُبتلا ہونا نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زندگی کو اس طرح قبول نہیں کرتے ہو جس طرح دوسرے لوگ قبول کرتے ہیں۔ بل کہ تم اس سے بلند ہونے کی کوشش کرتے ہو اور اس کی دہشت کا سامنا کرنے کے بعد تم سمجھ سکتے ہو کہ دراصل زندگی کیا ہے..... شاید تمھیں معلوم نہیں ہم کس قدر غلط چیزوں میں زندگی برباد کرتے ہیں؟..... آپ ایک ایک چیز کا نام لیں میں آپ کو بتا دوں گا۔ ہم وطن سے، لوگوں سے، قوم سے محبت کو، اپنے قبیلے کے جوش اور جذبے کو، اور دوسرے لوگوں سے میل ملاقات کو کس قدر غلط معنی پہناتے ہیں۔ جب کہ ہم اس معاملے میں بالکل کورے اور ناسمجھ ہوتے ہیں۔ صرف زندگی کی دہشت کو سمجھنے کے بعد ہی ہمیں احساس ہوسکتا ہے کہ وطن کیا ہے؟ قوم، قبیلہ کیا ہے؟ علم کیا اور عمل کیا ہے؟ فی الحال مختلف لوگوں کی دہشت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ فلاں کام کرو گے تو تمھیں فلاں آسودگی ملے گی۔ سیاست دان ہمارے خارج کا اور مُلّا ہمارے باطن کا استحصال اسی طرح سے کرتا ہے۔ سیاستدان اور مُلّا دونوں ہمیں یہ موقع ہی نہیں دینا چاہتے ہیں کہ ہم زندگی کی دہشت کا سامنا کریں اور اپنی خودی کا سامنا کر کے اپنا مقام بنا سکیں۔ اپنا مالک آپ بنیں..... میرے بھائی، انسان کہنے سے کوئی اپنی زندگی کا مالک نہیں بن سکتا جب تک وہ زندگی کی دہشت سے دوچار نہ ہوا ہو اور اس کو سمجھ نہ سکا ہو..... جب تم اس کو جان گئے تو پھر ایک قوم ایک آدمی اور ایک سوسائٹی بن جاتے ہو، لیکن وہ لوگ جو زندگی کی اس دہشت سے ناواقف ہیں جس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے..... تو وہ بس زندہ ہیں اور زندگی اُن کے لیے ایک وسیع میدان کی طرح پھیلی ہوئی ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اُن کی زندگی ہمیشہ اس طرح گزرتی ہے جو ہر قسم کی آسودگی سے خالی ہوتی ہے اور اُن کی اسی مفلسی اور بدحالی پر لوگ اپنی سیاست اور ملائیت کو چمکاتے ہیں اور وہ لوگ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ زندگی کی دہشت کو جان لیں اور اپنی زندگی تبدیل کریں..... مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ایک ٹیچر ہو، تم اُن کو سکھا دو کہ زندگی کی دہشت کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب اپنے آپ کو جاننا ہے۔ باقی سارے نظریے، فلسفے سب فکری دھاگے ہیں جنھیں تم خود باندھتے ہو اور خود ہی توڑ دیتے ہو، صرف زندگی کی دہشت کا احساس لازمی ہے۔ یہ تمام فلسفوں سے بلند تر ہے۔ وہاں ایک فرد کھڑا ہو کر اپنے خُدا سے سوال و جواب کر سکتا ہے جس کے بعد سارے فکری سسٹم بے کار ہو جاتے ہیں۔ بس یہی ایک دہشت زدہ انسان جان سکتا ہے کہ اُس کے، سوسائٹی، قوم قبیلے کا مطلب کیا ہے..... تم اسی دہشت کے مالک و مختار ہو اور اس کو جان لو..... اور میں اس دور افتادہ علاقے میں اس لیے آیا ہوں کہ میں سمجھ سکوں کہ انسان زندگی کی اس دہشت سے بلند کیسے ہوسکتا ہے۔

پھراس کے بعد زندگی اس کے لیے دوستی اور محبت کے خوبصورت دروازے وا کرتی ہے اور وہ کینہ ونفرت اور جنگ وجدل سے دامن چھڑانے لگتی ہے..... کیوں کہ یہ تمام جذبے دہشت کے احساس کے دشمن ہیں یہ تمھیں پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔ جب کہ دہشت کا احساس تمھیں بلند درجے پر فائز کرتا ہے۔ ابھی تک تم شخصیات کی تعریف وثنا سے تھکتے نہیں ہو۔ ابھی تک تم زندگی کے ٹھوس حقیقت کی نشے میں اس قدر بدمست ہو کہ تمھارے لیے زندگی ایک گریز، ایک ناچاقی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے لیے تم سب کے سامنے جھکتے ہو۔ سب کا آداب بجالاتے ہو۔ ابھی تک تمھاری سوچ تم سے جھوٹ بولتی ہے کہ صرف خدا نے تمھیں زمین پر پیدا کیا ہے..... وہیں سے تمھارے سارے فیصلے ہوتے ہیں۔ تم چاہے کتنی بھی شدت سے اپنا مقدمہ بیان کرو۔ وہ کمزور ہوگا۔ کیوں کہ تم زندگی کی دہشت سے انجان ہو..... ابھی تک تم حیوانوں کی طرح زندہ ہو۔ تم نے سر اُٹھانا نہیں سیکھا ہے۔ تم اُن روایتوں کا پاسدار ہو جو نیست ونابود ہو رہی ہیں۔ مٹ رہی ہیں۔

اب اگر تمھیں زندہ رہنا ہے تو پھر زندگی کی دہشت سے دوچار بھی ہونا ہوگا کیوں کہ یہ وہ احساس ہے جس میں سارا قوم، قبیلہ، ملک اور وطن ایک ہیں۔ جس کا بھی سامنا اس دہشت سے ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان ساری چیزوں کا مطلب کیا ہے۔ زندگی یہ نہیں جو تمھاری نظروں کے سامنے ہے۔ زندگی کی ایک اور تصویر بھی ہے جس کا عکس میری اور آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اس کا احساس تم کو اُس وقت ہو جائے گا جب تم زندگی کی دہشت کا سامنا کرو گے..... اور خُدا کرے کہ تمھارا سامنا اس دہشت سے ہو جائے۔ تاکہ تمھیں پتہ چل سکے کہ ان بوسیدہ روایتوں سے ہٹ کر بھی کوئی ایسی چیز ہے جس میں برداشت، علم، دوستی، شعور اور عقل کی بادشاہی ہے۔ تم ان چیزوں سے جتنا دور رہو گے اُتنی ہی یہ دہشت پروان چڑھے گی جوان کے سامنے مضبوطی سے استادہ ہے۔ پھراس کے بعد تم اپنے آپ کو جان پاؤ گے اور دُنیا کو سمجھ پاؤ گے..... ابھی تک تمھارا ماضی اس احساس سے بھاگنے، اسے کھونے سے عبارت ہے۔ تمھارے مستقبل کی تاریخ اسی دہشت کا سامنا کرنے سے صحیح ہوسکتی ہے ورنہ تم اس طرح بے نام ونشان ہو جاؤ گے جیسے دوسری قومیں ہوئی ہیں!.....''

سورج بلند پہاڑوں کے کوہانوں کے پیچھے چُپ رہا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ میں کیا سُن رہا ہوں..... کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ یہ آدمی ولی، بُزرگ، یا کوئی صوفی ہے یا کوئی بھوت..... اور وہ کس سے مُخاطب ہے؟..... اُس کی باتوں میں کتنی طاقت ہے، کتنا زور ہے کہ میں اُن کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں مگر میں اتنا جانتا ہوں یہ تمام باتیں اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں۔

میں نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا تو مہمان کو اشارہ کرنا چاہا کہ وہ اُٹھے تاکہ ہم گھر جائیں لیکن مجھ پر اس کا سحر اس قدر طاری تھا کہ میں خود میں یہ جرات پا نہیں سکا کہ اُس کو اس طرح اُٹھنے کا کہہ سکوں۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اُس سے کہوں کہ آپ یہاں سے مت جائیں۔ ہمیشہ کے لیے میرا مہمان بن جائیں۔ تاکہ میں آپ کی باتیں سُنتا رہوں، ہمیشہ، اسی طرح روانی سے.....!!..... لیکن

اُس نے مجھے موقع نہیں دیا، پھر کہنے لگا: ''کچھ دن پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں وادی میں جاؤں۔ یہ ہمارے مُلک کا ایک دُور افتادہ علاقہ ہے۔ کچھ دن میں وہاں کسی کا مہمان بن جاؤں۔ وہاں میں اُن معصوم اور ناسمجھ لوگوں میں رہوں۔'' جب اُس نے سگریٹ سُلگایا تو میں نے پوچھا:

''دہشت، دہشت گردی تو نہیں ہے۔''

وہ مسکرایا جس طرح ہم آج کل دہشت گردی کے ماحول میں ہمیشہ دہشت گردی کے بارے میں بات کرتے ہیں، کہنے لگا: ''دہشت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک ایسا سفر ہے کہ اس میں ہر قدم، ہر لمحے میں ایک ہنگامیت ہے۔ ایک کرب ہے۔ اگر کوئی اس کو نظر انداز کرنا چاہے تو وہ نقصان میں ہے۔ اگر تم اس کا مقابلہ کرو گے تو تمھاری زندگی تمھاری ہو جائے گی، اس پر کسی فلسفے کا تسلّط ہوگا نہ کسی نظریے کی حکمرانی۔ تم ان سب سے بلند سوچنے لگ جاؤ گے یا بلند ہو جاؤ گے کیوں کہ عظمت صرف دوستی اور محبت، دوسروں کا خیال رکھنے، برداشت کرنے میں پنہاں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی کوئی عظیم نہیں ہوسکتا نہ ہی کسی اور چیز سے بلندی کا رُتبہ پاسکتا ہے۔ باقی تمام چیزیں تمھیں پستی کی طرف لے جائیں گی۔ بلندی کی جانب کوئی راستہ جاتا ہے تو وہ دہشت ہی ہے کچھ اور تمھاری منزل نہیں ہوسکتی۔ یہ تمھاری کامیابی کا پہلا سبق ہے..... میں یہ نہیں کہتا کہ تم دہشت کو اپنی منزل سمجھ لو بل کہ اس سے بلند تر ہو جاؤ..... انگریزی میں اس کو Tragic Sense Of Life کہتے ہیں جو Terrorism سے بالکل الگ چیز ہے۔ دہشت یا Tragic Sense Of Life تمھیں اس لیے آن گھیرتی ہے کہ زندگی کی کوئی حتمی معنی موجود نہیں ہے۔ بل کہ یہ ایک کربِ مُسلسل ہے۔ جس کا علاج بس تمھارا عمل، کردار، حرکت ہے۔ زندگی کا مقصد ہی حرکت ہے۔ اس میں برداشت، محبت، خیال رکھنا سب شامل ہوتا ہے۔ ان کے بغیر تمھاری سب حرکتیں دہشت گردی (Terroism) کے زُمرے میں آتی ہیں۔ اس کے لیے تمھارے ہر فرد کو یہ سمجھنا پڑے گا تا کہ وہ اُس درجے تک پہنچ سکے کہ وہاں وہ زندگی کی عظمت پاسکے۔

''لیکن یہ بہت دشوار ہے۔''

''مگر حتمی بات بھی یہی ہے۔'' اُس نے کہا: ''نہیں تو تم اُسی درجے میں رہو گے، جس درجے میں ابھی ہو، تمھارا گریز، تمھارا قاچاق ہونا، تمھارا علم سے بے بہرہ ہونا اور دوسروں کے سامنے جُھکنا! یہ سب تمھیں پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔''

وہ اُٹھا اور ہم سکول کی جانب روانہ ہوئے۔ رات کی خاموشی، گاؤں کا سنّاٹا اور اُس کی باتیں، مجھے خود سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایسی بے سروپا اور اُلجھی ہوئی باتیں سُن رہا تھا لیکن مہمان کی باتوں میں کس قدر اثر تھا، یاخُدا..... یاخُدا یہ زندگی کیسے سمجھ میں آئے؟

رات، ہم دونوں بُہت دیر تک بیٹھے رہے، لیکن اب وہ بہت کم گُفتگو میں حصّہ لے رہا تھا۔ میں اُس

سے بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا۔ جن کے وہ ہوں، ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ جیسے اُس نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چُکا۔ اب اُسے کچھ بھی کہنا نہیں .....!، میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔

پھر ہم لیٹ گئے۔ میں سوچتا رہا۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ میں نے سوچا کل میں اُس سے کچھ اور پوچھ گچھ کروں گا کیوں کہ اُس کی باتوں کے بعد میرے ذہن میں بہت سے سوالات اُٹھے تھے جن کے جواب جاننا میرے لیے از حد ضروری تھا۔

صبح جب میری آنکھ کُھلی، تو مہمان ندارد۔ میں نے عرض محمد سے پوچھا اُس کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا؟ میں آج کے دن تک منتظر ہوں کہ وہ لوٹ آئے اور مجھے میرے سوالوں کا تشفی بخش جواب دے۔

☆☆☆☆

منیر بادینی
بلوچی سے ترجمہ: شرف شاد

ڈھول بتاشوں کا انجام

قتل کے عمل کو سرانجام دینے کے بعد وہ چھپتے چھپاتے جھونپڑیوں کے قریب سے ندی میں اُتر گئے۔ پھر اُس سلسلہء کوہ کی جانب نکل گئے جوان کے سامنے دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اندھیری رات کے باعث پہاڑ نظروں سے اوجھل تھے لیکن جب انیس بیس دن کا چاند انگڑائی لینے لگا تو نظروں کے سامنے پہاڑوں کی چوٹیاں ابھرنے لگیں۔ انہی پہاڑوں کی چوٹیوں سے نکلتی روشنی کو نگاہوں میں جمائے وہ تھکے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ اُن کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ لیکن وہ اُن سے بے پرواہ سورج نکلنے سے پہلے ایک ایسی محفوظ جگہ پہنچنا چاہتے تھے، جہاں تعاقب کرنے والے اُن کی دھول بھی نہ پا سکیں۔

اندھیری گھاٹی میں کافی دور جانے کے بعد نوجوان قاتل نے اپنے ساتھی بوڑھے قاتل سے سرگوشی کی، کوئی آواز سُنی تم نے؟ بوڑھا قاتل رُک گیا۔

''کیا ہُوا'' اُس نے نوجوان قاتل سے پوچھا اور کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ دونوں اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ دور کہیں ڈھول بتاشوں کی آواز آرہی تھی۔ اگست کے مہینے کی آخری عشرے کی خنک رات تھی۔

سارا جہان خاموشی کی بانہوں میں سمٹ گیا تھا۔ صبح صادق سے پہلے چلنے والی ٹھنڈی ہوا دور دراز کی آوازوں کو گھیر گھار کر اپنے دامن میں سمیٹ کر لا رہی تھی۔ دونوں قاتل ڈھول بتاشوں کی آواز صاف سُن سکتے تھے۔ وہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟۔ چاند کالے مہیب پہاڑوں کے پیچھے اُداس آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔

نوجوان قاتل نے منہ میں نسوار رکھتے ہوئے کہا ''شاید کہیں شادی کی کوئی تقریب ہو''

''شاید'' اُس کے بوڑھے ساتھی نے اُس سے تپاک کرتے ہوئے کہا مگر پھر کچھ سوچ کے بولا ''ہم بہت

دور نکل آئے ہیں۔ آس پاس کوئی گاؤں یا آبادی تو نہیں کہ شادی ہو رہی ہو؟ ..... میں ان علاقوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہاں میں جوانی میں گلّہ بانی کیا کرتا تھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مجھے بُری طرح پیاس لگی تھی۔ ڈھونڈنے پر بھی کوئی آبادی نہیں ملی ..... لیکن میں غلط بھی ہوسکتا ہوں۔ شاید ہم کسی آبادی کے قریب گذر رہے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے، ہم بُہت دور نکل آئے ہوں''

پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ اب وہ ایک ڈھلوان میں چل رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک پہاڑی سلسلہ پھیلا ہُوا تھا جبکہ سامنے ایک تاریک ڈھلوان اور اسی ڈھلوان کے آخری سرے سے ڈھول بتاشوں کی آواز آرہی تھی۔ اب یہ آواز اونچی اور صاف صاف اُن کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ دونوں قاتلوں کے قدم اُسی جانب اُٹھ رہے تھے۔

ڈھول بتاشوں کی اُداس کرنے والی آواز پہاڑیوں اور ڈھلوانوں کے درمیان ایک جادوئی سماں باندھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ فراموش کر چکے تھے کہ وہ ایک آدمی کو مار کر اُس کی لاش کھائی میں پھینک چکے ہیں۔ ڈھول بتاشوں کی آواز قریب ہوتی جارہی تھی۔ وہ دونوں رُک گئے۔ نوجوان ساتھی ایک بار پھر کہنے لگا۔

''چلیں وہاں پانی بھی پئیں گے۔ دوچاپی (بلوچی لوک رقص) بھی دیکھیں گے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' دوسرے ساتھی نے کہا'' کیونکہ پیاس سے میری جان نکلی جارہی ہے اور میرے پاؤں سوسو من بھاری ہو رہے ہیں۔''

پھر وہ اندھیرے میں ڈھول بتاشوں کی آواز کی جانب چلنے لگے۔ گاؤں کے آثار ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ کسان کے خمیدہ ہل کی طرح آدھا چاند بھی اپنے منزل کی جانب محوِ سفر تھا۔ بوڑھا ساتھی آدھے چاند کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی سے کہنے لگا۔

''دیکھو چاند بھی جیسے کسی نے دو حصوں میں کاٹ دیا ہے''

''کیا مطلب'' نوجوان ساتھی نے پوچھا

''میرا مطلب ہے کہ جیسے تم نے حاصل کی گردن کے دو حصّے کئے بالکل اسی طرح کسی نے چاند کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔'' نوجوان قاتل کچھ نہیں بولا۔ اُس نے اپنا دل بوجھل محسوس کیا۔ جیسے کسی نے اُس کی سانس روک لی ہو۔ اُس نے اپنے بوڑھے ساتھی سے کہا۔ ''چھوڑو اس بات کو، کوئی اور بات کرو'' بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ کھیلنے لگی جس کو اندھیرے میں اُس کا نوجوان ساتھی دیکھ نہیں سکا۔

جب وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو اچانک رُک گئے کچھ توقف کے بعد خاموشی سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔

یہ خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں اور خیموں کا چھوٹا سا گاؤں ڈھلوان کے کنارے آباد تھا۔ شاید گاؤں میں خوشی کا کوئی موقع تھا۔ کچھ خانہ بدوش نوجوان میراثیوں کے ڈھول بتاشوں کی لے پر رقص کر رہے تھے۔ وہ اپنے حال میں مست نظر آ رہے تھے۔ حالآنکہ رات کافی بیت چکی تھی اور اب صبح کے آثار شروع ہونے والے تھے لیکن ان کے رقص کا جنون ختم نہیں ہوا تھا۔ جب انہوں نے دونوں نئے مہمانوں کو دیکھا تو ان کو خوش آمدید کہا، خاطر مدارات کی۔ حقہ پانی کے بعد وہ دونوں بھی رقص میں شامل ہو گئے۔ ڈھول اور بتاشوں کی آواز زمین اور آسمان کو ایک کیے ہوئے تھی۔ دونوں قاتل ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ رقص میں بدمست وہ اپنے ماضی اور مستقبل سے بے خبر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے جس آدمی کو قتل کیا تھا وہ یہاں سے بہت دُور ایک خشک گھاٹی میں منوں مٹی تلے دبا ہوا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُسے کس نے مارا ہے۔ ڈھول بتاشوں کی ایک باری ختم ہوئی تو دوسری باری ایک عالمِ سرمستی میں اونچی ہو گئی۔ جیسے کسی پر جن اور بھوت کا سایہ پڑا ہو اور وہ زور سے چیخ و پکار کر رہا ہو۔ یہ ایک کیسی رات تھی کہ جس میں ان دو قاتلوں کو رقص کرنا تھا۔ دُنیا و مافیا سے بے خبر ہونا تھا۔ گاؤں والے تعجب میں پڑ گئے تھے کہ ان دونوں مہمانوں کو خدا نے دو چاپی اور رقص کی کیسی صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ تھکنا بھی نہیں جانتے تھے۔ نہایت ہی مہارت اور کمال کے ساتھ رقص میں مشغول تھے۔ آخر میں گاؤں کے لوگوں نے خود رقص کرنا چھوڑ دیا تھا بس اُن دونوں ساتھیوں کے رقص سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک نہایت ہی بڑے پتھر پر بیٹھے گاؤں کا سرپنچ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ خُدا نے اُن دونوں کو رقص کرنے کی کیسی نایاب صلاحیت عطا کی ہے۔ بوڑھا اور نوجوان دونوں نے مراثیوں کو تھکا دیا لیکن خود رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ مسلسل رقص کیے جا رہے تھے جیسے آج کی رات اُنہیں رقص کرتے ہوئے اپنی جان جان آفرین کے سُپرد کرنا ہو۔

جب رقص کرتے ہوئے وہ حال سے بے حال ہو گئے تو لہر کی آخری ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی آخری ساز بھی رُک گئی تو وہ دونوں بے دم ہو کر گر گئے اور لوگوں نے تالیاں بجا کے انہیں داد دی۔

پھر ڈھول بتاشوں کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور گاؤں والے اپنی جھونپڑیوں اور خیموں کی جانب چلے گئے تو وہ دونوں گاؤں کے ایک کونے پہ بنے ایک جھونپڑی کے سامنے لیٹ گئے۔ پَو پھٹنے سے کچھ پہلے، نوجوان قاتل

بوڑھے قاتل کے بستر کے پاس آیا اور اُس سے پوچھا:

''ہم نے حاصل کو کیوں مارا؟''

''اس لئے کہ وہ سیاہ کار تھا''

''کون کہتا ہے'' نوجوان نے عجیب وغریب لہجے میں پوچھا جیسے ڈھول بتاشوں اور رقص نے اُس کے اندر چھپے حقیقی انسان کو جگا دیا ہو۔

''یہ کیا سوال ہوا، کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' بوڑھے ساتھی نے پوچھا۔

''میں پاگل نہیں ہوں لیکن تم نے مجھے کیوں ساتھ لیا تھا؟''

''اس لئے کہ حاصل ہم دونوں کے گھر سیاہ کاری کا مرتکب ہوا تھا۔ اُس کا انجام سوائے موت اور کیا ہوسکتا ہے۔''

''مجھے اس سوال کا صحیح جواب چاہئے ورنہ میں تمھیں مار دوں گا'' اُس نے بوڑھے کے سامنے اپنا خنجر لہرا دیا۔ بوڑھا ساتھی حیرت میں پڑ گیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اُس نے اٹھنا چاہا لیکن نوجوان نے اُس کو اُٹھنے نہیں دیا: ''تم اُٹھ نہیں سکتے''

''بے حیا'' بوڑھے نے کہا ''میں تمھارا چاچا ہوں، تمھاری بہن کے ساتھ سیاہ کار ہونے والے شخص کو مارنے میں تمھارا ساتھ دیا ہے۔ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہو، تمھیں شرم آنی چاہیے''

نوجوان ساتھی نے اپنا خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا ''میری بہن سیاہ کار نہیں تھی، یہ ایک الزام ہے جس کا مجھے بے حد افسوس ہے، میں تمھیں مار کے رہوں گا، تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا''

''آخر تمھیں ہُوا کیا ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا، لیکن تمھیں مرنا پڑے گا'' بوڑھا ساتھی اُس کی منّت سماجت کرتا رہا، دھونس دھمکی دیتا رہا لیکن اس سے پہلے کہ کسی اور کو خبر ہوتی نوجوان ساتھی کا خنجر اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اس کے بعد نوجوان نے یہی خنجر اپنے سینے میں اُتار دیا۔

صبح ڈھول بتاشوں کی خوشیوں کے بعد گاؤں کے لوگوں نے اُن کے جنازے اُٹھائے۔ گاؤں والوں کے لئے اب بھی یہ ایک سربستہ راز تھا کہ ڈھول بتاشوں کا انجام اس طرح کیوں نکلا۔؟

☆☆☆☆

بلوچی ادب سے

تخلیق وترجمہ: غنی پرواز

چشمہ اور گُلاب

غمشاد آگے چلنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمزاد نے اُسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور برابر پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس لیے وہ ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور دو قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دو قدم آگے بڑھ رہا تھا اور چار قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ چار قدم آگے بڑھ رہا تھا اور آٹھ قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اور اس طرح منزل سے نزدیک ہونے کی بجائے دُور ہوتا جا رہا تھا۔

سامنے والے پہاڑ کے دامن میں، کھجور اور چیڑ کے درختوں کے درمیان، ایک چشمہ تھا۔ یہ چشمہ اُس کی منزل تھا۔ وہ وہیں جانا چاہتا تھا۔ اور اگر وہاں پہنچ جاتا، تو زندگی میں کامیاب ہو جاتا۔

پچھلی جانب گُلاب کا ایک پھول تھا۔ وہ پھول اُس کی منزل نہ تھا۔ بلکہ اُس کی منزل کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ لیکن ھمزاد اُسے اُسی پھول کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ اس لیے اُسے کھینچتا ہوا وہیں لے جا رہا تھا۔

''آپ کیوں اتنا زور لگا رہے ہیں اور چشمے کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں''، ھمزاد نے اُس سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میری منزل وہی ہے۔ اگر مجھے کوئی کامیابی نصیب ہوگی، تو وہیں سے۔ مگر آپ مجھے گلاب کے پھول کی طرف کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟'' اُس نے ھمزاد کی بات کا جواب دیتے ہوئے اُس سے پوچھ بھی لیا۔

''اس لیے کہ گلاب کے پھول کے پاس دُنیا کی ہر خوشی موجود ہے۔ دُنیا کی ہر قسم کی خوشی۔ اور انسان دنیا میں انہی خوشیوں کے لیے دن رات سرگرداں رہتا ہے''۔ ہمزاد نے اپنا وجود اس کے وجود کی گہرائیوں میں گُم کر کے کہا۔

''مگر آخر وہ تھوڑی دیر کی خوشیاں ہیں نا۔۔۔''

''لوگ انہی تھوڑی دیر کی خوشیوں کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔لیکن یہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کو نصیب ہو رہی ہیں، تو پھر آپ کیوں اُن کی قدر نہیں کرتے؟''

''ایسا نہ ہو کہ میرا انجام آدم وحوّا جیسا ہو۔۔۔'' اُس نے سوچ کر کہا۔

''آدم وحوّا کے انجام میں بھلا کیا خرابی رہی ہے؟ اگر آپ کا انجام اُن جیسا ہو، تو پھر آپ کو اور کیا چاہیے؟'' ہمزاد نے مزید ترغیب دی۔

''مگر۔۔۔۔مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔۔''

''ڈریئے نہیں۔۔۔۔دل بڑا کیجئے۔۔۔۔خوشیاں آپ کی منتظر ہیں۔۔۔''

ہمزاد کے مسلسل اصرار کی وجہ سے وہ نرم پڑ گیا۔اور اُس کے ساتھ ہو لیا اور گلاب کے پھول کا رُخ کیا۔ذرا قریب پہنچ کر رُک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔اُس کی نظر میں وہ ایک عجیب وغریب گلاب تھا۔ ہر لمحہ رنگ بدلتا ہوا گلاب! جو کبھی ایک چیز بنتا اور کبھی دوسری!۔۔۔کبھی جنتی باغ بن جاتا۔کبھی بنگلہ!۔۔۔کبھی کار موٹر!۔۔۔کبھی شراب کا پیگ!۔۔۔کبھی حسین وجمیل لڑکی۔۔۔۔اور کبھی روپوں سے بھری ہوئی تجوری!

یکا یک وہ اشتیاق سے گلاب کی جانب بڑھنے لگا۔لیکن پھر ایکدم دوبارہ رُک گیا اور افسردگی اور حیرانی سے بولا۔

''مگر۔۔۔۔مگر اس کے تو چاروں جانب بہت بڑی دلدل ہے۔''

''پرواہ نہ کریں۔۔۔۔'' ہمزاد نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔اور کہا ''دَلدل کے اوپر ایک پُل ہے۔۔۔ذرا وہاں دیکھئے تو سہی۔۔۔وہ پُل ہے۔۔۔''

جب اُس کی نگاہیں پُل پر پڑیں تو اُس کی افسردگی اور حیرانی میں کمی آ گئی۔اُس نے ہمزاد کے ساتھ پُل عبور کر لیا اور گلاب کی گوناگوں خوشیاں لوٹنے میں مصروف ہو گیا۔

خوشیاں لوٹنے کے بعد، اُس نے واپس اپنی منزل کی طرف جانا چاہا۔چشمے کی طرف۔اور اُس نے اپنی رہنمائی کے لیے ہمزاد کو تلاش کرنا شروع کیا۔لیکن ہمزاد دکھائی نہ دیا۔اس لیے وہ تنِ تنہا پُل عبور کرنے لگا۔ پُل لمبا اور تنگ تھا۔اُس نے ابھی تک اُس کا آدھا حصہ بھی عبور نہیں کیا تھا کہ بادل گرجنے لگے۔بادل کی گرج سن کر وہ اِس بُری طرح چونکا کہ پُل پر سے گرتے گرتے بچا۔پھر گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے نگاہیں

اوپر اٹھا کر بادلوں کی طرف دیکھا۔اور بارش کے ڈر سے اپنے چلنے کی رفتار میں اضافہ کرلیا۔لیکن ابھی وہ پانچ چھ قدم سے زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا کہ اچانک زور کی بارش ہونے لگی اور آن کی آن میں پُل کے اوپر پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔

اب اُس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد پُل کو عبور کر لے۔لیکن پُل پر بہت زیادہ پھسلن ہوگئی تھی۔جس کی بناء پر اس کے لیے جلدی جلدی چلنا مشکل تھا۔ بلکہ اُس کے قدم پہلے سے بھی سُست پڑ گئے تھے۔پھر جب اُس نے محسوس کیا کہ صرف پاؤں سے چلنے میں، پھسل کر، گرنے کا اندیشہ ہے، تو اُس نے بیٹھ کر پاؤں کے ساتھ ساتھ، ہاتھوں سے بھی کام لیا۔لیکن اُس کے لیے اب بھی جلدی جلدی چلنا مشکل تھا۔

اب بارش مزید زور پکڑنے لگی تھی۔جس پر اُس نے بوکھلاتے ہوئے ایک بار پھر نگاہیں اُٹھا کر اوپر آسمان کو دیکھا۔مگر اچانک اُس کے ہاتھ پاؤں پھسل گئے۔اور وہ پُل سے نیچے دلدل میں گر گیا۔اور کیچڑ کے اندر دھنستا چلا گیا۔اُس نے پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ مدد کے لیے اوپر اٹھائے۔۔اور چیخنا چلانا شروع کیا۔

''بچاؤ۔۔۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔!'' لیکن کوئی شخص مدد کے لیے آتا ہوا نظر نہ آیا۔پھر اُس نے اپنے ہمزاد کو زور زور سے پکارا ''اے میرے ہمزاد! تم کہاں ہو؟ میں دلدل میں پھنس گیا ہوں، آ کر مجھے بچاؤ۔۔۔'' مگر وہ بھی پہلے کی طرح غائب رہا۔۔۔

تاہم اُس کی چیخ و پکار سن کر، نجانے کہاں سے، ایک خوفناک مگر مچھ ضرور نمودار ہو گیا تھا، جو اُس کی جانب تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔۔۔۔!!

☆☆☆☆

پروفیسر صبا دشتیاری
بلوچی سے ترجمہ: مہجور بدر

سُوکھے پتّوں کا سنگیت

''پت جھڑ کا موسم بھی عجیب موسم ہے۔ ہر طرف ایسا لگتا ہے جیسے موت کا راج ہو۔ پیڑوں کی طرف آنکھیں پھیلائیں تو ایسا لگتا ہے جیسے موت کا فرشتہ اپنے دانت بجا رہا ہو۔ لوگ لمحہ بھر کے لیے اپنی نگاہیں بے پتے اور بے ثمر پیڑوں پر ٹھہرا نہیں سکتے ہیں۔ کوئی کتنا بھی نہ ہونے کے خوف کو کچھ نہ سمجھے لیکن وہ بڑے باغوں میں چھوٹے بڑے پیڑوں کو دیکھتا ہے تو اپنے دل میں ایک نادیدہ خوف سر اُٹھائے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ اپنی نگاہیں بند کر لے لیکن آنکھیں بند کرنے سے پیڑوں کے بے لباس بدن ایسے ہی غائب ہو جائیں گے۔ شاید یہ ہو جائے کہ نہ ہو جائے یہ تو ہر کسی کے اپنے محسوسات ہیں۔ کچھ تو زندگی سے خائف ہیں اور کچھ موت کی اتھاہ گہرائیوں میں زندگی کے معنی تلاش کرتے ہیں''۔

''عبدل'' نے اپنی کتاب کی یہ سطریں پڑھتے ہی اضطراب کے ساتھ کتاب بند کر کے ایک طرف پھینک دی اور اک لمحہ کے لیے کھڑکی کے باہر کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ وہ کتاب کی مطالعہ شدہ باتوں کی نقشیں باہر ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ شب دیجور میں کیا دیکھ سکتا ہے، لیکن جیسا کہ اُس کے دل نے چاہا کہ یہ ناول کے یہی حصہ نے جس کو اضطراب کی ہے کچھ معنیٰ دے جائیں۔ اسی لیے ادھر اُدھر اپنی نگاہیں چار کیں۔ اُس نے یہی سوچا تھا کہ ناول کے اس حصے نے اس کے باطن میں ایک روشنی پیدا کر دی ہے۔ اور وہ اس شبِ دیجور میں بھی گھر کے پیچھے کے پیڑوں کے جسم کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اُن کے بے لباس زندگی کو پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اندھیرے کے لیے اندر (باطن) کی روشنی کچھ کام نہ آسکتی ہے۔ بلکہ باہر کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور باہر خوفناک ہوا لمحہ کتوں کی بھونک اور مینڈکوں کی ٹرٹر کی آواز کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ عبدل نے بہت کوشش کی کہ اپنے اندر کی روشنی سے کام لے مگر اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ اندر کی روشنی کھو رہی ہے اور اندھیرا پھر بڑھ رہی ہے۔ اس لیے کھڑکی بند کر کے چارپائی پر لیٹا اور کتاب ہاتھ میں لی لیکن اب تک اُسے اوپر والا حصہ ہضم نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے کتاب اُسے ستا رہی تھی۔ اس لیے ٹوٹی ہوئی کرسی پر، سگریٹ لے کر جلایا اور کش لگانا شروع کیا پھر دانشوروں کے طرز پر سگریٹ کے دھوؤں میں بے لباس پیڑوں کے بدن کو دیکھنے لگا لیکن اس نے جلد ہی سوچا کہ خالی سگریٹ کے دھوئیں کچھ کام کے نہیں ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ آنکھیں جل رہی ہیں۔ اس لیے اپنے

اوپر خود ہنسنے لگا۔

''یہ دانشور کیسے سگریٹ کے دھوؤں میں زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں تو کچھ نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ شاید میں دانشور نہیں ہوں۔۔۔ لیکن دانشور بھی ناول اور افسانے پڑھتے ہیں۔ میں بھی اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کرتا۔۔۔ وہ بھی فلسفہ کی کتابوں کے دیوانے ہیں اور میں بھی۔۔۔ اگرچہ فلسفہ کو سمجھ نہیں سکتا ہوں مگر فلسفیوں کے نام اور عملوں کو جانتا ہوں۔۔۔ لیکن پھر بھی میں سگریٹ کے دھوئیں میں زندگی کے معنی کو کیوں دیکھ نہیں سکتا ہوں؟''

عبدل نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ جل رہے ہیں یعنی سگریٹ کب کے جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اب عبدل کے دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا تھا اور نیند کے سرد جھونکے اُسے مدہوش کر رہے تھے۔

سورج ڈھلوانوں میں اتر چکا تھا۔ عبدل اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ایسا پرسکون تھا جیسے وہ شاہی بوپ اور بالشتوں پہ آرام کر رہا ہے۔ دیگر اور کام تو اُسے نہ تھا والد کی وفات کے بعد میٹرک کیا اور اب روزگار کے لیے در بہ در تھا۔ بیوہ ماں نے محلہ میں ''بانکانی چلوبگی'' کر کے دو وقت کی سوکھی روٹی ڈھونڈ نکالتی ماں کا اکلوتا تھا۔ اس لیے ''پیرزال'' کو گوارا نہ ہوا کہ اُسے روزگار کے لیے مجبور کرے۔ ماں کو دیر تھی کہ وہ ''بانک'' کہ پاس گئی تھی۔ وہ پتہ نہیں کیسے خواب سے بیدار ہو کر باورچی خانہ کی طرف گیا۔ کوہلوں پہ چائے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بغیر دیکھے ایک، دو جیسکا لے کر گھر سے نکل گیا، دو قدم باغوں کی طرف گیا تو رات کے ناول کے پہلے حصہ کے حرف حرف پھر سامنے آنے لگے۔ خشک اور بے لباس درخت۔۔۔ زندگی اور موت کے معنی۔ اُس نے جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے، سائنسدانوں کی طرح باغ کی جانب روانہ ہوا۔ اُس نے نزدیک سے دیکھا کہ درخت بے لباس ہیں۔ مگر اس کے پاؤں پتوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ اُس نے جانا کہ درختوں نے اپنے لباس کھیت پر پھیلا دیئے ہیں اور فطرت کی طرح لے لباس ہونا چاہتے ہیں۔

عبدل نے جب اپنے قدم آگے بڑھائے تو پھر پتوں کر کر نے اس کے دل میں خیالوں کی سنگیت سمندر کی لہروں نے شروع کی۔ خیالوں کے سمندر، زندگی کے معنیٰ ڈھونڈنے کے جذبے، پتوں کی سنگیت کے اندر خیالوں نے اپنے جسم پہاڑوں کی طرح نمایاں کرنا شروع کیے لیکن عبدل نے نہیں جانا کہ ان خیالوں کو کیسے ایک مکمل فلسفہ کہ طور پر پیش کروں۔ وہ خود کو ہمیشہ دانشور سمجھتا تھا مگر زندگی کے معنی کی جستجو اور تلاش اُس کے لیے جیسے پہاڑ ڈھانے کے برابر تھا۔

وہ ابھی تک پتوں کے سمندر میں اپنی رات کے ساتھ مصروف تھا کہ اس کو کوئی اور بڑا کہرّ کہرّ کی آواز نے چونکا دیا۔ یہ آواز دور سے نہیں بلکہ اس کے نزدیک ہی سے آ رہی تھی۔ پہلے تو لرزا کہ شاید کوئی بھوت پریت ہو کہ اس کی ماں نے کہا تھا کہ پت جھڑ کے موسم میں بھی بھوت ہوتے ہیں۔ پتوں کو روندنا انھیں بُرا لگتا

ہے۔عبدل نے منہ موڑا تو دیکھا کہ ایک ''پیر مرد'' بوڑھا آدمی بڑا کتاب بغل میں لیے ہوئے ہے۔اس کی طرف آرہا ہے۔مگر وہ نہ رُکا اور تیز تیز وہاں سے گذرا جیسا کہ ہوا ''گوات'' گذرتی ہے اور اُسی لمحہ غائب ہوگیا۔عبدل کو اتنا بھی ہمت نہ ہوا کہ اُسے روک کر حال احوال پوچھے۔پھر اُس نے یہی سمجھا کہ شاید وہ پاگل اور دیوانہ ہو۔

روز مرہ کی طرح عبدل آج پھر نوکری کی تلاش کرتے ہوئے ایک محلے سے اپنے گاؤں کی طرف آرہا تھا۔وہ خوش تھا کیونکہ آج اُسے ماسٹری کی نوکری ملی تھی اور اس کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ ایک استاد بن جائے۔ناسمجھ اور جہالت کے سماج کے اندر زندگی کے معنی اور مطلب تلاش کرنے،لوگوں کو سمجھانے کا کام کر سکے۔ایسے تو اس کی خواہش کبھی ہری نہیں ہوئی تھی۔لیکن آج نجانے کہاں سے اس کا سویا ہوا نصیب جاگ اٹھا تھا۔وہ یہ جانتا تھا کہ اس کی ماں اس نوکری سے خوش نہیں ہوگی مگر وہ خوش تھا۔

اس محلے سے گذرتے وقت اس نے دیکھا کہ کچھ بچوں کا ہجوم ہے،شوروغوغا کر رہے ہیں۔وہ اس بھیڑ کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے نزدیک آکر دیکھتا ہے کہ ایک آدمی بندر لے کر نچا رہا ہے۔اس کے مختلف جمپ اور چھلانگوں پر بچے بہت خوش تھے۔تالیاں بجا رہے تھے،ناچ رہے تھے۔بندر نے بہت رقص دیکھایا۔بچوں کے ہاتھوں میں جو بھی تھا انہوں نے وہ ساری چیزیں بندر کے سامنے پھینک دیں۔بندر کو نچانے والا شخص پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔اب اسے اپنا کھیل ختم کرنا تھا اس لیے کھڑا ہوگیا۔

عبدل نے دیکھا تو اس کا سر چکرانے لگا کیونکہ وہ اس شخص کو جانتا اور پہچانتا تھا مگر وہ حیران تھا کہ کہاں اور کیسے؟۔۔۔ذہن پہ زور دیا۔۔۔دیکھتا ہوں کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔اچانک خیال آیا کہ یہ وہی آدمی ہے کہ بڑی کتاب بغل میں لیے ہوئے تھا اور درختوں کے خشک پتوں کو روندتا ہوا اس کے قریب سے گذرا تھا جیسے کوئی بجلی چمک کر گذرے۔وہ لمحے اور یہ وقت۔۔۔وہ آدمی اور یہ حالت۔۔۔عبدل سمجھا نہیں کہ بات کیا ہے اس لیے اُسی وقت آگے جاتے ہوئے پیر مرد کا ہاتھ پکڑا اور پوچھا:

''واجہ! آپ کون ہیں؟ یہ سب کیا ہے؟''

پیر مرد نے جواب دیا:

''میں ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ہوں۔۔۔زندگی کی جستجو کے بعد اب کھانے کی جستجو میں نکلا ہوں۔۔''

یہ پیر مرد کی باتوں سے جیسے کوئی تیز ہوا چلی اور سارے پیڑوں کے پتوں نے ہجرت کر کے کھیت میں پھیل گئے۔

عبدل نے یہی سوچا کہ جیسے کہ یہ پیڑ میں بیٹھے ہوئے بچے اور عورت سوکھے پتے ہیں اور وہ اور پیر مرد بے لباس درخت ہیں اور دونوں درختوں کے پتوں کے سمندر میں ڈوب گئے ہیں مگر یہ سوکھے پتوں کی سنگیت غائب ہے۔

بلوچی ادب سے

تخلیق و ترجمہ: یعقوب شاہ غرشین

سب مر گئے۔۔۔

اٹھو۔۔۔ بھاگو۔۔۔ نکلو۔۔۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ تاریک کمرے میں زوردار آوازیں گونجنے لگیں۔ صبور خان کا سارا گھرانہ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھا اور سب بے اختیار دیواریں ٹٹول کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر ایک کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ قیامت خیز شور و غوغا بپا تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ زمین پر عجب لرزش طاری تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے دھرتی شق ہونے والی ہے۔ گھر کے کچے کمروں کی دیواریں اور چھتیں شرارتی بچوں کی طرح اُچھل کود رہی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ یوں بج رہے تھے جیسے کوئی انہیں پیٹ رہا ہو۔ خوف و دہشت کی شدت پورے جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھی۔ زمین کی لرزش سے اُٹھنے والی لہریں اعصاب میں بجلی کے کرنٹ کی مانند دوڑ رہی تھیں۔ زمین پر قدم نہیں ٹک رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قدموں سے زمین سرکا رہا ہو۔ ایک حشر برپا تھا اور عجب نفسا نفسی کا عالم تھا۔

صبور خان اور اس کی بیوی کو چھوٹے بچوں کی پڑی تھی۔ دونوں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اپنے بچوں کو زور زور سے پکار رہے تھے اور انہیں کمرے سے جلدی نکلنے کی تاکید کر رہے تھے۔ دونوں چھوٹے بچوں کے بستر کی طرف لپکے۔ اس کی بیوی نے دیوانہ وار سوئے ہوئے اسد خان کو گود میں اٹھایا اور نکلو!۔۔۔ بھاگو! دوڑو!۔۔۔ کے نعرے لگاتی ہوئی دروازے کی جانب بھاگیں۔

گھر کی دیواریں مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہی تھی۔ چھت کی لکڑیوں اور بانسوں سے چیں چیں کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا گھر کسی جھولے میں رکھ دیا گیا ہو اور وہ سب جھول رہے تھے۔ آرائشی سامان اور طاقچوں میں رکھے برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی جھنکار میں ان کی چیخ و پکار دب کر رہ گئیں تھیں۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی دھڑام سے دیوار گرنے کی ہولناک آواز سنائی دیں۔ اسد

خان کی ماں کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی، اس نے پوری قوت سے فوراً بیٹے کو باہر دھکیل دیا جو صحن میں منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے بعد زوردار آوازوں کے ساتھ مسلسل دیواروں کے گرنے کی صدائیں بلند ہونے لگیں جس سے زمین کی لرزش میں مزید اضافہ ہوا۔

بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان واقع یہ چھوٹی وادی زلزلے کی گڑگڑاہٹ اور بڑے بڑے پتھروں کے لڑھکنے کے شور سے گونج رہی تھی۔ چٹانوں کے تڑکنے کی تیز آوازیں اس پیالہ نما وادی میں بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔ اس میں شہتیروں کے چٹخنے کی کھڑکھڑاہٹ، دیواروں کے گرنے کی دھوم دار آوازیں، ملبے تلے دبنے والوں کی خوفناک چیخیں اور زخمیوں کی کراہنے کی آوازیں شامل تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے عجیب روشنیاں پھوٹ کر آسمان پر بجلی کی مانند کوند رہی تھیں۔ رات کی تاریکی میں دھول کے طوفان سے ٹمٹماتے ہوئے تارے بھی چھپ گئے تھے۔

اسد خان کے سر پر ہلکی سی چوٹ لگی تھی۔ وہ خوف و دہشت سے مغلوب ہو کر درد کا احساس بھول چکا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے سرزمین سے اٹھایا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی جھولے میں بیٹھا ہو۔ اس نے اٹھنے کی پوری کوشش کی لیکن چکرا کر پھر گر پڑا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دھول کے طوفان میں سب کچھ چھپ گیا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندھا ہو چکا ہو۔ تیز ہواؤں کی دھول سے بچنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ زور زور سے بے ساختہ چلانے لگا، ''سب مر گئے، سب مر گئے''۔

چیخ و پکار کا شور اور گھروں کے گرنے کی ہولناک آوازوں کی بازگشت دیر تک گونجتی رہی۔ چند لمحے بعد اس میں پہاڑی تودوں کے گرنے کا مہیب شور اور تیز ہواؤں کے اٹھنے والے بگولوں کی سرسراہٹ بھی شامل ہو گئی۔ ایک ہنستا بستا گاؤں آناً فاناً پیوند خاک ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے شور تھما اور ہر طرف موت کی خاموشی چھا گئی۔ اسد خان نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا دیر تک بڑبڑاتا رہا ''سب مر گئے، سب مر گئے''۔۔ اس کے بعد اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

دھیرے دھیرے رات کی تاریکی چھٹنے لگی تو سردی کی شدت میں اضافہ ہوا۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی، سپیدی سحر نمودار ہوئی تو گرد و غبار کا طوفان بیٹھ چکا تھا۔ ہر طرف اداس سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں سے نہ اذان کی صدائیں گونجیں، نہ مرغوں نے بانگ دیں، نہ ہی کتوں کے بھونکنے اور بھیڑ بکریوں کے ممیانے کی آوازیں ابھریں۔ اسد خان ہوش میں آیا تو اس نے کروٹ بدلی اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا

''ماں''۔۔۔شدید سردی سے اس کا جسم اکڑ رہا تھا۔اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اردگرد نگاہیں دوڑائیں تو صبح کی مدہم روشنی میں چاروں طرف ملبے کے ڈھیر ہی ڈھیر نظر آئے۔ ہو کا عالم تھا، نہ گاؤں تھا نہ کوئی گھر۔۔۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں کھنڈرات ہی کھنڈرات دکھائی دے رہے تھے۔وہ گھر کے ملبے کے بیچ میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔اس کا سارا جسم مٹی سے اٹا ہوا تھا۔وہ حیران و پریشان باؤلوں کی طرح اردگرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔گزرے سانحے کی یاد اس کے ذہن میں خواب کی مانند گھومنے لگی۔دھیرے دھیرے اس کے ہوش وحواس بحال ہوئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اپنے ماں باپ کو پکارتے ہوئے دیوانہ وار اپنے منہدم کمرے کی جانب بھاگا۔وہ دیر تک مٹی کے ڈھیر پر گم سم کھڑا سوچتا رہا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔اس کی حالت اس نوزائیدہ بچے کی مانند تھی جسے اس کی ماں سنسان جنگل میں جننے کے بعد چل بسی ہو۔ اس کی نال مردہ ماں کے جسم سے اٹکی ہوئی ہو اور وہ فطرت کے رحم وکرم پر اکیلا پڑا زاروقطار رو رہا ہو۔اب نیلا آسمان اس کا باپ اور خاکی زمین اس کی ماں تھی۔

ایک بار پھر خوف کی شدت سے اس کے دماغ میں زلزلے کی ہولناک گڑگڑاہٹ کی بازگشت گونجی۔اس کے رگ وپے میں سنسناہٹ پیدا ہوئی۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں گرم خون کی بجائے پگھلی ہوئی برف کی ندیاں بہہ رہی ہوں۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا بدن منجمد ہو چکا ہو۔دہشت زدہ دماغ کے تہہ خانوں میں وسوسوں کے بگولے اٹھ رہے تھے۔میرا ہنستا بستا گاؤں اچانک کھنڈرات میں کیسے تبدیل ہو سکتا ہے؟ یہاں تو سنسانی کا عالم ہے۔نہ کوئی آواز، نہ در و دیوار، نہ کوئی ذی حس۔۔۔اس نے اپنے دماغ پر بے تحاشا زور ڈالا۔اس کے ہر سوال کا ادھورا جواب ''زلزلہ'' پر آ کر اٹک جاتا تھا۔ذہن میں زلزلے کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگتی اور اس کا سر چکرانے لگتا۔زلزلے کی ہم سے کیا دشمنی تھی؟ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ اس نے سب کچھ کیوں پیوند خاک کیا؟ پورے گاؤں کو مٹی کے ڈھیر میں کیوں تبدیل کر دیا؟ اس کا ننھا سا ذہن اپنے گھر بار کی تباہی کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھا۔اسے یاد آیا، رات کو بابا نے اخروٹ توڑ کر کھلائے تھے اور ماں ''موسیٰ خان گل مکئی'' کی لوک داستان سناتی رہی۔اس دوران نہ جانے کب میری آنکھ لگی تھی۔ ہاں، پچھلی رات کو میں ایک بار اس وقت جاگ گیا تھا جب چھوٹا بھائی جانان زور زور سے رو رہا تھا اور ماں اس کا جھولا جھولتے ہوئے ''للے للو'' کہہ کر اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔

میرے ماں باپ، بہن بھائی اور رشتہ دار مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے دیوانہ وار اپنے چھوٹے سے گاؤں کے اردگرد کئی چکر لگائے۔۔۔روتے ہوئے اس کی

ہچکی بندھ گئی۔۔۔وہ پوری قوت سے چیخا چلایا۔۔۔اپنے خاندان کے ہر فرد کو بار بار پکارا۔۔۔رشتہ داروں اور دوستوں کے نام لے کر آوازیں دیں۔۔۔اس کی زوردار آوازیں اونچے پہاڑوں کی سنگین چٹانوں سے ٹکرا کر بازگشت پیدا کرتی رہیں۔۔۔مگر اپنی ہی آواز کی بازگشت کے سوا اسے کوئی صدا سنائی نہیں دی۔دور پہاڑ کی اونچی چوٹی سے اداس سورج کا روشن چہرہ اُبھرا،اس کی لطیف کرنوں نے اسے اپنے حصار میں لیا اور اسد خان کی ذرا ڈھارس بندھی۔اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔پہاڑی جھرنے کا رستا پانی اشکوں کی مانند اونچی چٹان سے ٹپک رہا تھا۔یہ پانی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان برساتی نالے میں یوں بہہ رہا تھا جیسے کسی روتے ہوئے بچے کے چہرے پر آنسوؤں کا دھارا ہو۔صنوبر کے درخت دھول سے اٹے ہوئے ماتم کناں نظر آئے۔سیب اور چیری کے باغات کے پتے جھڑ چکے تھے اور اس کے برہنہ درخت سر جھکائے سوگوار کھڑے تھے۔چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔وہ اپنائیت کے احساس سے دیر تک اس اداس منظر کو تکتا رہا۔پہاڑ جوں کے توں اپنی جگہ پر ڈٹے کھڑے تھے صرف کوہ تکتو کی تین اونچی چوٹیوں میں سے ایک نظر نہیں آ رہی تھی،شاید وہ بھی ڈھے چکی تھی۔

اسد خان ہر طرف سے مایوس ہو کر واپس اپنے گھر کی طرف پلٹا تو اپنی بہن گل بشرہ کے کتے ''زڑ گئی'' کو گھر کا ملبہ کریدتے ہوئے پایا۔اس کے قدموں کی چاپ سنی تو اس نے دم ہلاتے ہوئے ہوا میں کئی چھلانگیں لگائیں اور دوڑ کر اسد کے قدموں سے چمٹ گیا۔اس کے منہ سے دردناک چیخیں یوں نکل رہی تھیں جیسے رو رہا ہو۔گھر کے پچھواڑے میں جانوروں کا کمرہ زمین بوس ہو چکا تھا۔وہ وہاں سے جان بچا کر نکلا تھا۔اس کی پچھلی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی،اس لیے لنگڑا کر چل رہا تھا۔اسد خان نے بے اختیار اسے گود میں اٹھایا اور بے تحاشا چومنے لگا۔اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کتے کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے۔اس کے حلق میں بھی شدت غم سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔زڑ گئی مچل کر اس کی گود سے نکلا اور اسی جگہ چلا گیا جسے وہ پہلے کرید رہا تھا۔اسد خان بھی اس کے پیچھے دوڑا۔اس کی نظر ملبے میں دبے چادر کے کونے پر پڑی جس کے اوپر پڑی مٹی کو کتا،بہت احتیاط سے کرید رہا تھا۔اسد خان تیزی سے لپکا اور مٹی اور پتھر ہٹانے لگا۔اسے مٹی سے آلودہ بے جان ہاتھ نظر آیا جس میں وہ سنہرا کڑا دکھائی دیا جو اس کا بابا اپنی چہیتی بیٹی گل بشرہ کے لیے شہر سے لایا تھا۔اس کے نازک ہاتھ پر عید کے موقع پر مہندی سے بنے بیل بوٹے موجود تھے۔اس نے روتے ہوئے تیزی سے مٹی اور پتھر ہٹانے شروع کیے۔کچھ دیر بعد گل بشرہ کا خاک آلود بدن نظر آیا۔وہ دیر تک اس کی پیشانی کے سبز خال کو تکتا رہا۔یہ خال اس کی ماں نے نظر بد کی خاطر کھدوایا تھا۔اس نے پوری قوت سے اسے اوپر کھینچا اور

ملبے کے ڈھیر سے باہر نکالا۔۔۔گل بشرہ کا چہرہ خزاں رسیدہ پھول کی طرح مرجھا چکا تھا۔اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی اور جسم اکڑ چکا تھا۔اسد نے اسے ہلایا جلایا۔۔۔زور زور سے آوازیں دیں۔۔۔لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔کیا وہ مر چکی ہے؟اس نے کسی مردے کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا،البتہ وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم بے جان ہو جاتا ہے۔اس سے لپٹ کر رونے کے بعد اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔گل بشرہ کو زلزلے نے مار دیا ہے۔۔۔اس کے معصوم اور حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے اسد کے دل میں ٹیس اٹھی اور اسے زلزلے سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔۔۔کتے نے اس کا جسم سونگھا اور پاگلوں کی طرح چاروں طرف کئی چکر لگائے اور پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کر دردناک انداز سے یوں بھونکنا شروع کیا جیسے رو رہا ہو۔آخر کار نڈھال ہو کر وہ تھوتھنی اپنی مالکن کے قدموں پر رکھ کر سوگوارانہ انداز میں بیٹھ گیا۔

اپنی بہن کی لاش ملبے سے نکالنے کے بعد اسے یہ یقین ہو گیا کہ اس کا خاندان کہیں نہیں گیا بلکہ گھر کے ملبے تلے دبا ہوا ہے۔اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اس کے خاندان کا کوئی فرد اب بھی زندہ ہو۔مجھے جیسا بھی ہو سب کو ملبے سے جلد از جلد نکالنا چاہیے۔اسے یاد آیا کہ ماں نے باہر دھکیل کر میری جان بچائی۔وہ خود دوسرے بچوں کو نکالنے کی خاطر کمرے کے اندر پلٹی اور اسی دوران کمرے کی چھت گر پڑی تھی۔یہ سوچتے ہوئے اس نے تیزی سے پتھر اور اینٹیں باہر پھینکنا شروع کر دیئے۔اس کے نازک ہاتھ شل ہوئے۔شدید سردی کے باوجود آنسوؤں اور پسینے کے قطروں نے اس کے خاک آلود چہرے کو دھو ڈالا تھا۔۔۔ اس دوران جب اس نے چھت کے بانسوں کے درمیان پڑی چٹائی ہٹائی تو اس کے نیچے اسے لال رنگ کا زری لباس نظر آیا۔اس کی ماں اکثر اسی رنگ کے کپڑے پہنتی تھی۔اس نے تیزی سے چٹائی کے تنکوں کو ایک ایک کر کے کھینچتے ہوئے سوچا۔یہ ماں ہی ہوگی۔وہ مجھے موت کے منہ سے نکال کر خود منوں مٹی تلے دب چکی ہے۔۔۔آہستہ آہستہ ماں کا چہرہ اور ہاتھ نمودار ہوئے۔۔۔اس نے پیار سے اس کے اکڑے ہوئے ہاتھوں کو چوما جو برف کی طرح سرد تھے۔۔۔ماں کے سینے سے لپٹ کر اس کا گرد آلود چہرہ صاف کیا۔۔۔اس کی پکار نے آسمان کا سینہ چیر ڈالا۔

ماں۔۔۔پیاری ماں۔۔۔

ماں کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔۔۔اس نے نہ اپنے غمزدہ بیٹے کو سینے سے لگایا اور نہ ہی اپنے مخصوص الفاظ ''قربان،صدقے جاؤں۔۔۔'' کہے۔اس کی چیخوں کی بازگشت فضا میں گونجی۔میری ماں

نہیں مرسکتی۔۔۔میری ماں نہیں مرسکتی۔۔۔، ماں کی ٹانگیں بڑے شہتیر کے نیچے بری طرح پھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے پورا زور لگایا مگر وزنی شہتیر کو ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ چیونٹی کی طرح شہتیر سے چمٹ کر اسے ہٹانے کی کوشش میں تھک ہار کر ہانپنے لگا۔۔۔آخر کار بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے پھر ماں کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا۔۔۔چند لمحے بعد اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ رکھنے کا احساس ہوا۔غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کے احساس کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو پھٹے پرانے قمیص میں ملبوس، دراز الجھے بالوں والا، برہنہ پا، لمبا تڑنگا سراپا سامنے کھڑا تھا۔۔۔یہ جانو دیوانہ تھا۔ یہ وہی درویش تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر دور کہیں پہاڑوں میں رہتا تھا اور کبھی کبھار آبادی کا رخ کرتا۔ وہ اکثر خاموش رہتا تھا، جب کبھی بولتا تو اس کی معنی خیز باتیں ان پڑھ دیہاتیوں کی سمجھ میں نہ آتیں۔ وہ اکثر ایک ہی بات کی رٹ لگایا کرتا تھا۔ بدبختو! زمین پر اکڑ کر نہ چلا کرو، دھرتی کا انتقام بہت سخت ہوتا ہے۔۔۔آج جانو دیوانہ بہت بدلا ہوا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی کی بجائے محبت اور شفقت کے آثار نظر آرہے تھے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس سے ڈر کر بھاگ جاتا لیکن اس حالت میں جانو دیوانہ اسے سر پر تنے ہوئے چھت کی مانند لگا۔ وہ بے اختیار جانو سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ گل بشرہ مرگئی۔۔۔ماں مرگئی۔۔۔سب مرگئے۔۔۔کوئی زندہ نہیں بچا۔۔۔ سب مرگئے۔۔۔جانو نے اسے گلے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیٹا! انسان اور فطرت ہر وقت حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں، قدرتی آفات تو فطرت کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ ہم اس کے وار نہیں سہہ سکتے البتہ خود کو محفوظ رکھنے کی تدابیر ضرور کر سکتے ہیں۔۔۔ہم جب بھی غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو فطرت پچھلی شب کی طرح شب خون مارتی ہے۔۔۔ویسے بھی زندگی اور موت کا ازلی کھیل جاری رہتا ہے۔۔۔ہم سب نے مرنا ہے۔۔۔ہم سب مریں گے۔۔۔اس اٹل حقیقت کو جھٹلانا ہی انسان کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔۔۔افسوس، لوگ مٹی کے گھروندوں سے دل لگاتے ہیں اور آخر کار انہیں کے ملبے تلے دب کر مرجاتے ہیں۔۔۔جانو نے اسد خان کا شانہ پ تھپتھپاتے ہوئے کہا، بیٹا! تم میری باتوں کو دیوانے کی بڑ نہ سمجھنا، انسان اس وقت تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتا جب تک اس پر کوئی بڑی افتاد نہ آن پڑے۔۔۔خیر، ہمیں ہر وقت مالک کی مرضی پر راضی بہ رضا ہونا چاہیے۔ حوصلہ رکھو، اللہ غفور و رحیم ہے۔ آؤ! مل کر ملبہ ہٹاتے ہیں اور مرحومین کی تدفین کا بندوبست کرتے ہیں۔

اسد خان کے والد اور چھوٹے بھائی جانان کی لاشیں کمرے کے وسط سے برآمد ہوئیں۔ بابا نے اسے اپنی بانہوں میں مضبوطی سے سمیٹا تھا۔ انہوں نے جانان کو بہت مشکل سے بابا کے اکڑے ہوئے بازوؤں

سے الگ کیا۔ گویا وہ مرنے کے بعد بھی اسے اپنے آپ سے دور رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کمرے کی چھت بابا کے عین سر پر گری تھی اور اس کے سر سے خون رس رہا تھا۔ بڑا بھائی صمد خان اپنے بستر کے قریب دیوار کے نیچے دبا تھا۔ وہ سونے کا بہت شوقین تھا، اب بھی یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔

سورج غروب ہونے سے پہلے دونوں نے مل کر بہت مشکل سے پورے خاندان کی لاشیں نکالیں اور ایک بڑی قبر کھود کر انہیں اکھٹا دفنا دیا۔ مردوں کے نکالنے کے کام میں کتے (زڑگئی) نے بڑی مدد کی۔ اس نے مٹی سونگھ کر اپنے مالکوں کے دبنے کے مقام کی نشاندہی کی۔ جانو نے اسد خان میں ہمت اور حوصلے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ذرا دیر نہیں ستائے اور بھوکے پیاسے خاموشی سے ملبہ ہٹانے اور مردوں کو دفنانے کے کام میں لگے رہے۔ اس روز آسمان پر بے شمار گدھ منڈلا رہے تھے جو ان کے اردگرد چکر لگاتے رہے۔۔۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو جانو پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، وہ کہنے لگا، ہم سب نے مرنا ہے۔۔۔ ہم سب مریں گے۔۔۔ اس نے اسد خان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ بیٹا! تم میرے ساتھ چلو، ہم اپنے غار میں گزر بسر کریں گے۔ اس آفت زدہ بستی میں اب مردوں کا تعفن پھیلے گا جس سے وبائی امراض پھوٹنے کا خطرہ ہے۔ میں تمہیں اس شدید سردی کے موسم میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرنے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ویسے بھی دن کو سر پر منڈلاتے گدھ اور رات کو پہاڑوں سے اُترنے والے بھیڑیئے بہت سفاک ہوتے ہیں۔ وہ مردوں کے ساتھ تمہارا بھی تکا بوٹی کر دیں گے۔۔۔ اسد خان نے اس کا مہربان ہاتھ تھاما، مایوسی سے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور ''سب مر گئے'' کہہ کر جانو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس نے قبر کے سرہانے بیٹھے ہوئے کتے کو چمکارا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا اور اپنا سر اگلی ٹانگوں پر رکھ کر گویا ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس وقت دور سے گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ جانو نے آسمان کی طرف دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا اور اسد خان کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر اپنی منزل کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ اس کے منہ سے سورۃ زلزال کی مقدس آیات پھوٹ رہی تھیں جس کے انوار کی تجلی بہار کی ہلکی برکھا کی مانند پوری وادی پر برس رہی تھی۔

اِذَا زُلزِلَتِ الاَرضُ زِلزَالَھَا۔ وَاَخرَجَتِ الارضُ اَثقَالَھَا۔ وَقَالَ الاِنسَانُ مَالَھَا۔۔۔۔

☆☆☆☆

گزارش

خود بھی اور اپنے دوست احباب کو بھی اس گروپ کا ممبر بنائیں۔

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم

www.facebook.com/groups/AAKUT/